نگارستان فارس

آزاد

نگارستانِ فارس

یعنی

مشاہیر شعرائے فارسی کے سوانح عمری

خدائے سخن اُستاد رودکی سے لیکر نور العین واقف بٹالوی تک

از

شمس العلماء مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور

حسب فرمائش

آغا محمد طاہر مینیجنگ پروپرائٹر آزاد بک ڈپو لاہور

۱۹۲۲ء

میر امیر بخش کے کریمی پریس لاہور میں چھپا

قیمت مجلد و مطلا

(طبع اوّل)

قیمت معمولی ۳/

تبرکات آزاد

دربار اکبری } شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر اور اسکے نورتن کا تاریخی افسانہ۔ دلچسپ حالات۔ رزم بزم۔ شادی و غم۔ ہندو مسلمانوں کا ملاپ اگر آپ مولینا کے جواہر نگار قلم سے لکھا ہوا دیکھنا چاہیں تو دربار اکبری منگائیے۔ اصل میں یہ کتاب اُس عہد کی تاریخ ہے۔ یا یوں کہئے کہ ۲۲×۲۹ کے ۸۵۰ صفحوں پر انشا پردازی کا گلشن کھل رہا ہے قیمت عشر

دیوانِ ذوق } مغل شہنشاہی کے آخری چراغ ابوظفر محمد بہادر شاہ کے اُستاد ملک الشعرا خاقانیِ ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمہ کا کلام اور تمام قصیدے جس قدر بہم پہنچ سکے اور دیباچہ میں سوانح عمری۔ یہ کتاب آب حیات کے بعد مشرقی بہار کا دوسرا افسانہ ہے۔ ایک ایک لفظ کہیں موتی اور کہیں آنسو کی جھلک مارتا ہے۔ ۲۰×۲۶ = ۳۶۰ صفحے قیمت عہ

مجموعہ مکتوباتِ آزاد } مخزن والوں نے ایک دفعہ مولینا آزاد کے چند خط چھپوائے تھے۔ جن کی سادگی اور دلچسپی پر ادب کے دلدادہ ہزار جان سے عاشق ہو گئے تھے۔ اب نہایت محنت اور کوشش سے سینکڑوں خط بزرگوں۔ دوستوں۔ شاگردوں اور افسروں کے نام کے جمع کئے ہیں۔ پہلے ایک پنکھڑی تھی۔ اب گلدستہ ہے۔ الفاظ کی بندش اور مطلب کی ادائیگی طرز تحریر پر قربان ہو جاتی ہے۔

سیر ایران } مشرقی زبانوں کے محقق نے ہندوستان اور پنجاب سے نکل کر ترکستان و ایران تک تحقیق کا دامن بچھایا تھا۔ آخری سفر ایران کے بعد اپنے سفر کے حالات مولینا نے ایک دلچسپ لکچر میں خود بیان فرمائے تھے جس کا ایک ایک لفظ معلومات اور محبت کے رس سے بھرا پڑا ہے۔ سیر ایران کی ابتدا میں وہ لکچر ہے اور پھر روزنامچہ سفر ایران جسکی تعریف سے زبان قاصر ہے۔ الفاظ نہیں جو اسکی سادگی کو ادا کر سکیں۔ جس کا ہر ایک فقرہ ایران کے نقشے اور مرقعے کھینچتا ہے۔

ملنے کا پتہ :-

آغا محمد طاہر مینیجر آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھو العلی الاعلیٰ

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

خدا کی شان ہے کہ میاں باوا رحمۃ اللہ علیہ دلّی میں پیدا ہوئے۔ دلّی والے کہلائے اور سچ مچ آپ تھے بھی دلی کے۔ مگر آپ کے کمالات کا سکّہ ایران و توران میں چلا۔ جس طرح آپ اُردو زبان کے مالک یا اُستاد ہیں اسی طرح شیراز و اصفہان کی فارسی بھی آپ کی ایک لونڈی ہے۔ یہ تو زمانہ جانتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر بھی تھے۔ آپ کو شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا۔ آپ نثار بے بدل۔ ایک شاعر باکمال تھے۔ آپ کی تصنیف سے ایک عالم فیض یاب ہو رہا ہے۔ آپ نے ایران کے سفر بھی کئے پُرانی فارسی کے محاورات کی چھان بین بھی آپ نے خوب کی ہے مگر اس کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ وہ ایک ازلی مناسبت اردو فارسی زبان کی عالم بالا سے دنیا میں لیکر آئے تھے۔ جس دن سے آپ کی زبان کھُلی اور جب تک آپ کی زبان چلتی رہی ایک ٹکسال تھی جس میں اُردو فارسی کی روپیہ اشرفیاں ڈھلتی رہیں۔ دلّی میں ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے تھے مگر حضرت آزاد دلّی کی کان کے دُرِّ یتیم تھے۔ ایران اور توران کا رستہ کھُلا ہوا ہے۔ کاروان آتے بھی ہیں جاتے بھی ہیں۔ جانے والے ان ملکوں سے سوغات میں انگور سیب اور آلوے بخارا کے سوا اور کیا لاتے ہیں۔ ملک فارس کے شہروں اور جنگلوں کے خواب

دیکھتے ہیں اور ہندوستان میں آکر بھول جاتے ہیں مگر حضرت آزاد کا وہاں جانا بادِ نسیم کا گلشن میں جانا تھا کہ گلزارِ ایران سے سب رنگ و بو ہندوستان میں اُڑا لائے۔ پلٹے تو سعدی و فردوسی بن کر پلٹے۔ فارسی میں غزل یا قصیدہ کہدینا کچھ بڑی بات نہیں۔ جیسے ہست و بود آتا ہے وہ زلف مشکیں کی آبداری۔ نرگس چشم کی جادوگری عارضِ پُرنور کی فسوں سازی کو فارسی میں نظم کرسکتا ہے مگر کھانے پکانے چلنے پھرنے گھر کے دھندوں کو فارسی لباس پہنانا اور اس طرح ادا کرنا جس طرح ایک ماژندرانی یا نیشاپوری ادا کرسکتا ہے محال اور اگر کہہ بیجئے تو ایسے ہی ناموزوں ہونگے جیسے ایک آغائے تازہ ولایت کی اُردو۔ مگر میاں باوا کی تحریر و تقریر کو سُن کر اہلِ زبان نے دل و جان سے پسند کیا۔ مگر یہ یوں ہی ہوا کہ

	بخت و دولت بکار دانی نیست جُز بتائیدِ آسمانی نیست	

روئی کے سفید گالے چاندی کے کھرے پتّروں کا وزن اور قیمت کب پا سکتے ہیں۔ زرد ہلدی سونے کے رنگ ڈھنگ کہاں سے لاسکتی ہے سکندر ہزاروں ہوگزرے مگر سکندر وہی تھا جس نے سدسکندری بنائی۔ رستم بھی لاکھوں بن چکے ہیں مگر رستم وہی گنا جاتا ہے جس نے ہفت خوان کو طے کیا۔ اُردو کی وسعت اور ترقی کو دیکھئے تو ہندوستان سے نکل کر غیر ملکوں میں پہنچ گئی۔ گویا انگور کا افشردہ خم میں بھرا ہوا تھا جو گرمی پاتے ہی اُبل پڑا اور بادہ نوش اُس کی بُو سونگھ کر ہونٹ چاٹنے لگے اور جھوم جھوم کر فرمانے لگے بھئی کتنا اچھا خمیر اُٹھا ہے۔ آج اُردو زبان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی گنتی گنئے تو لاکھوں سے اوپر نکلیگی مگر میاں باوا کے جواہر پاروں سے کوئی لگّا نہیں کھاتی سندی اُردو نہیں گنی جاتی پڑھ کر دل شگفتہ نہیں ہوتے روح لذّت نہیں پاتی۔ حضرت آزاد کا دماغ قدرت الٰہی کا ایک عجائب خانہ تھا جس میں ہنر اور خوبی کی انگنت چیزیں سجی ہوئی تھیں۔

چنانچہ ان کے تھوڑے تھوڑے نمونے آپ کی بوقلموں تصنیف میں پائے جاتے ہیں۔ ایک سے ایک انوکھے۔ ایک سے ایک عجیب و غریب دل لبھانے والے ایک سے ایک زیادہ پرفیض اور فائدہ بخش۔ سخندان فارس آپ دیکھ چکے ہیں فیلالوجی کے فن کو کس طرح اُس میں تحریر فرمایا ہے اور ہم ہندوستانیوں کو نیا رستہ کس خوبی سے دکھایا ہے۔ سخندان فارس نام تو آپ کی کتاب کا ہے مگر درحقیقت سخندان فارس خود بدولت ہی تھے فیضی ابوالفضل ہوں یا ہمارے میرزا غالب مرحوم اِن حضرات نے فارسی تحقیق تدقیق میں حضرت آزاد جیسی کاوش اور محنت نہیں اُٹھائی۔ ان حضرات کی بڑی عرق ریزی یہی تھی کہ اپنے گھر میں یا اپنے شہر میں فارسی دواوین فارسی علم ادب کی کتابیں یا فارسی زبان کی لغت اور فرہنگیں پڑھ لیں یا ترک اُوزبک مغل افغان جو ایران توران افغانستان سے دلّی آگرہ میں وارد ہوئے اُن کی گفتگو سن کر اپنے ذہن رسا اور حافظہ خداداد کے ذریعے سے محاورے یاد کرلئے۔ مگر قصّہ زمین برسرزمین پورا ہوا کرتا ہے۔ فارسی زبان کی تحقیق کے لئے ان میں سے ایک صاحب بھی دلّی کے کابلی دروازہ سے باہر نہ نکلے یہ حضرت آزاد کا ہی جگرا اور حوصلہ تھا کہ سفر کی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیل کر فارسی کی سرزمین میں پہنچے۔ وہاں کے دستور اور موبدوں سے ملے ژند پاژند دری پہلوی سغدی زابلی کابلی۔ فارسی زبانوں کی الگ الگ جُدا جُدا چھان پھٹک کی۔ ایرانی تورانی قوموں کے میلے ٹھیلے دیکھے۔ اُن کی شادی غمی کی مجلسوں میں شریک ہوئے۔ اور سخندان فارس کا ایسا تحفہ بنایا کہ دایان فرنگ نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے وطن کو لے گئے۔ اس سے بہت پہلے دوسرا حصہ بھی تیار کرلیا تھا۔ اور نگارستان فارس اُس کا نام رکھا۔ اس تذکرہ میں رودکی شاعر سے لیکر نورالعین واقف تک شعرائے فارسی زبان کے احوال قلم بند کئے۔ مجھے یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس تذکرہ

کو آپ نے کس خوبی اور کس خوش اسلوبی سے سجایا ہے کیونکہ حضرت آزاد کی تصنیف آفتاب کی چمک و نمک رکھتی ہے۔ آفتاب کسی تعریف کا محتاج نہیں ہیں افسوس کرتا ہوں کہ اس وقت علامہ شبلی زندہ نہیں ہیں وہ اس تذکرہ کو دیکھ کر حضرت آزاد کے کمال کی داد دیتے کیونکہ وا سے برجانِ سخن گر بہ سخنداں نرسد۔ قدر جوہر شناسد یا بداند جوہری + وہ خود مورّخ اور تذکرہ نویس فارسی کے زباں داں اور شاعر مجمع علوم و فنون تھے۔ حضرت آزاد کی کتابوں کو بہت عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اہل کمال اپنے ہم پیشہ ہم رتبہ کی ضرور تعظیم کرتے ہیں اور ان حضرات کی کیا پاک روحیں تھیں۔ ایک دوسرے کا نام سُن کر سر جُھکا دیتے تھے۔ مجھے یہ تو عرصہ سے معلوم تھا کہ باوا میاں نے نگارستان فارس بھی ایک تذکرہ لکھا ہے مگر اُسے میں نے دیکھا نہ تھا۔ میرے والد ماجد مرحوم کو بھی اس تذکرہ کی جستجو رہی۔ کئی بار تلاش کیا مگر تصانیف اور مسودات کے انبار میں پتہ نہ چلا اور حضرت والد ماجد دنیاے فانی کو چھوڑ کر عالم باقی کی طرف رہگرا ہوئے۔ اور باوا میاں کی تصنیف کی درستی میرے سر آپڑی۔ ایک دن کاغذات اُلٹ پلٹ کر رہا تھا جو ایک مندراسی کپڑے میں بندھا بندھایا نگارستان کا نسخہ مل گیا خدا کا شکر بجالایا۔ میرزا عبد القادر بیدل نے خوب فرمایا ہے

سنم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

آنکھوں سے لگایا اور سر پر چڑھایا۔ حضرت موصوف نے اس تذکرہ کو بنا سنوار کر مکمّل کر لیا تھا چھپوانے کا دل میں تہیہ ہوگا جو چرخ کینہ جو نے آپ کی طبیعت اور آپ کے دماغ کو برہم کر دیا۔ میخانہ کا دروازہ بند ہوگیا بادہ نوش العطش العطش کہتے رہ گئے اور کفِ افسوس ملنے لگے۔ اگر آخر زندگی تک حضرت کے حواس باقی رہتے تو ایک یہ کتاب کیا خدا جانے کتنے بہشت اور فردوس دنیا میں بنا کر

چھوڑ جاتے۔ بہر حال شکر و احسان ہے کہ نگارستان فارس کی محبوبہ نے حمّام کر کے نیا لباس پہنا۔ چھاپہ کی مشاطہ نے اسے کنگھی چوٹی سے درست کر دیا۔ اگر اس پر بھی اس میں کچھ عیب و نقص دیکھا جائے تو حضرات ناظرین اسے میرا قصور سمجھیں کیونکہ حضرت آزاد جیسی میں استعداد اور نظر کہاں سے لاؤں۔ وہ زندہ ہوتے اور اُن کے سامنے یہ چھپتی تو واللہ اعلم کس انتظام و اہتمام سے اسکی تصحیح فرماتے اور کیا لعل و یاقوت لگاتے۔ اہل نظر اس کے مطالعہ کے بعد مجھ ناکارہ کے لئے دعا فرمائیں تاکہ ہمت اور استقامت کے ساتھ حضرت آزاد کی تصانیف شائع کرتا رہوں فقط

بندہ

طاہر نبیرۂ حضرت آزاد

آزاد منزل۔ اکبری منڈی

لاہور۔ ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگارستانِ فارس

ابو عبد اللہ محمد رودکی

یہ صاحب ایجاد رہنے والا قصبہ رودک علاقہ سمرقند کا تھا۔ اگرچہ اندھا مادرزاد تھا لیکن چھوٹی عمر میں بقدر ضرورت علم حاصل کیا۔ چونکہ خوش آواز اور خوش گلو تھا علم موسیقی کی طرف رغبت ہوئی اور بربط بجانے میں کمال حاصل کیا۔ اس ذریعہ سے چوتھی صدی کے شروع میں امیر نصر ابن احمد سامانی کی قدردانی سے رتبۂ عالی حاصل کیا اس کی کثرت انعامات کے باب میں مولوی جامی نے کہا ہے

رودکی آنکہ در ہمے سُفتے	مدحِ سامانیاں ہمے گفتے
صلۂ شعرہائے ہچو دُرش	بود در بارِ چار صد شترش

اس کے علاوہ عنصری اور دقیقی و نظامی عروضی وغیرہم اکثر شعرائے نامی نے اپنے اپنے کلام میں اُس کی نظم کی تعریف کی ہے۔ دولت شاہ کہتا ہے رودکی دو سو ٢٠٠ غلام چھوڑ کر مرا تھا۔ اس سے اور مال و اسباب کو قیاس کر لینا چاہیئے۔ شعر فارسی نے اس وقت تک رواج نہیں پایا تھا۔ لوگ متفرق بیتیں اور شعر کہتے تھے۔ اگر کسی صاحب طبیعت سے دو شعر ہم قافیہ موزوں ہو جاتے تھے

تو اُس کو دو بیتی کہتے تھے۔ جب رودکی کی طبیعت شعر پر مائل ہوئی قصیدہ رباعی
و غزل وغیرہ ایجاد کیا۔ کتاب کلیلہ و دمنہ تمام و کمال نظم کی اُسکے صلہ میں عنصری کہتا ہے

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش ۔۔۔ عطا گرفت بنظم آوری زکشور خویش

کل اشعار اُس کی تصنیفات کے ۱۳ لاکھ شمار میں آئے۔ صاحب ہفت اقلیم ایک لاکھ
تیس ہزار لکھتا ہے۔ اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہر شے کی کس مقام سے
شروع ہوتی ہے اور درجہ بدرجہ کس قدر اُس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اُس سے مرات
یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ تک کیا خیالات اور کیا لوگوں کے حالات تھے۔
اُس وقت تک اس فن کو اکثر مضامین حکمت اور نصیحت میں صرف کرتے تھے۔ کیونکہ
شعر کے قالب میں کلام زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ ایک دفعہ بادشاہ بخارا سے ہرات دولت
میں آیا۔ بسبب توقف کے اہلِ لشکر جدائی اہل و عیال سے نہایت دق ہوئے۔ رودکی مرات
سے التجا کی۔ اُس نے بخارا کی تعریف اور اشتیاق میں ایک غزل کہہ کر بادشاہ کے سامنے ہفت
پڑھی کہ بادشاہ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور بے موزہ پہنے روانہ ہوا۔ اگرچہ
وہ غزل بہ نسبت کلام متاخرین کے فصیح نہیں معلوم ہوتی لیکن سب مُصنّف اسی طرح مرات ا
لکھتے ہیں۔ عجب نہیں کہ یہ تاثیر اُس کی اُس وقت بسبب علم موسیقی کے ہوئی ہو یا یہ کہ
اُس ابتدائی زمانہ میں اس قدر نظم نے بھی کمال فصاحت سے دل پر تاثیر کی ہو ؎

بوے جوے مولیاں آید ہمے ۔۔۔ یادِ یارِ مہرباں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی ۔۔۔ میر زے شادماں آید ہمے
میر ماہ است و بخارا آسماں ۔۔۔ ماہ سوئے آسماں آید ہمے
میر سرو است و بخارا بوستاں ۔۔۔ سرو سوئے بوستاں آید ہمے

اُس کا کلام اس قدر کثرت سے ہے کہ ایک جگہ تدوین نہیں ہو سکا بیاضوں اور
تذکروں سے جہاں دیکھے نئے شعر منقول دیکھے۔ کلام اس کا اگرچہ رطب یابس ہے
مگر باوجود اس کے اُس کا اُستادی کا لقب ایسا لوگوں کے دلوں پر نقش ہے کہ کوئی

چون وچرا نہیں کرسکتا۔ کسی شخص نے اس باب میں دقیقی شاعر کے سامنے گفتگو کی (دقیقی پہلا مصنف شاہنامہ کا تھا مگر حالتِ شروع تصنیف میں بدکاری کے سبب سے قتل ہوگیا تھا) چنانچہ دقیقی نے اُسے روکا اور یہ قطعہ کہا ؎:-

اے آنکہ طعنہ کردی در شعر رودکی
این طعنہ کردنِ تو ز جہل است و کودکی

کانکس کہ شعر داند داند کہ در جہاں
صاحبقران ملکِ سخن ہست رودکی

مفتاح التاریخ
غرض رودکی ۳۴۳ سنہ ہجری میں فوت ہوا۔ چند شعر اس کے بطریقِ انتخاب لکھے جاتے ہیں:-

اشعارِ قصیدہ بمضمون پیری

ہفت اقلیم

مرا بسود و فرو ریخت ہرچہ دندان بود
نبود دندان لا بل چراغ تابان بود

سپید سیم زدہ بود و دُرّ و مرجان بود
ستارۂ سحری بود و قطرہ باران بود

یکے نماند کنوں زاں ہمہ بسود و بریخت
چہ نحس بود ہمانا کہ نحس کیوان بود

نہ نحس کیوان بود و نہ روزگار دراز
چہ بود راست بگویم قضائے یزدان بود

؎ زمانہ پندے آزادہ وار داد مرا
زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است

بروزِ نیک کساناں تو غم مخور زنہار
بسا کسا کہ بروز تو آرزومند است

؎ شاد زی با سیاہ چشماں شاد
کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

ز آمدہ شادماں نباید بود
واز گزشتہ نہ کردہ باید یاد

نیکبخت آں کسے کہ داد و بخورد
شور بخت آنکہ او نخورد و نداد

سحبان العجم حکیم ابوالقاسم فردوسی

تذکرۂ دولت شاہی

اس صاحبِ کمال کا نام حسن کنیت ابوالقاسم اور اہل فن میں سحبان العجم خطاب تھا۔ باپ کا نام اسحاق ابن شرف شاہ مولد قصبہ شاداب تھا۔ موضع رزان علاقۂ شہر طوس میں اسحاق مذکور کی زمینداری تھی اور عمید الملک حاکم طوس کے

چار باغ میں (جس کا نام فردوسیہ تھا) باغبانی پر نوکر تھا۔ اس تخلّص کا یہی سبب ہے۔ ۳۲۸ھ میں پیدا ہوا۔ تمام اہل کمال قائل ہیں کہ جب سے فارس میں شاعری شروع ہوئی کوئی شاعر زبردست فصیح البیان فردوسی کے برابر نہیں ہوا۔ خصوصاً رزم گوئی اور معرکہ آرائی۔ کہ نظیر اپنا نہیں رکھتا۔ چنانچہ شاہنامہ ۶۰ ہزار شعر کی کتاب اس بات پر گواہ ہے۔ سعدی و انوری و خاقانی و ظہیر فاریابی و نظامی وغیرہ بڑے بڑے شاعر جلیل القدر اشعار اس کی تعریف میں کہتے ہیں کہ نقل اُن کی تطویل کلام ہے چنانچہ مولوی جامی کا قول ہے۔ قطعہ :-

هفت اقلیم و دیباچہ شاہنامہ تذکرہ دولت شاہی

در شعر سہ کس پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبیّ بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را	فردوسی و انوری و سعدی

انوری کہتا ہے ؎ :-

آفریں بر روان فردوسی	آں ہمایوں نژاد فرخندہ
او نہ اُستاد بود و ما شاگرد	او خداوند بود و ما بندہ

نظامی کہتا ہے ؎

سخن گوے پیشینہ دانائے طوس	کہ آراست روئے سخن چوں عروس

سعدی کہتا ہے ؎

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد	کہ رحمت براں تربت پاک باد

دولت شاہ بھی یہی قطعہ نقل کر کے لکھتا ہے کہ :-

طبقۂ اول

" قصاید انوری پر خاقانی نے قصاید لکھے۔ سعدی کے مقابل ہیں "
" امیر خسرو نے غزل اُس سے رنگین تر کہی لیکن فردوسی کے برابر کسی نے "
" حق شعر نہیں ادا کیا ہے۔ اگر نظامی کو کہیں تو مضائقہ نہیں لیکن تامّل "
" سے دونو طرزوں کو دیکھ کر انصاف کرا در منصف ہو کر ساتھ راستی کے حکم لگا۔ " فقط
شعرائے فارس پہلے متفرق اشعار کہتے تھے۔ تیسری صدی میں رودکی شاعر سے اس فن

نے ترقی شروع کی اور وہ سنہ ۴۳۲ھ میں مرگیا۔ اُس کا ہم عصر اسدی طوسی ایک شاعر
[خاتمہ شاہنامہ] زبردست فردوسی کا استاد تھا۔ چونکہ سنہ ۴۰۰ ہجری میں شاہنامہ ختم ہوا اور تخمیناً ۸۰ برس
کی عمر میں فردوسی مرگیا۔ پس معلوم ہوا کہ سنہ ۳۲۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ غرض جب فردوسی سنِ تعلیم
کو پہنچا۔ تحصیل علم میں مشغول ہوا۔ تاریخ کا بہت شوق تھا۔ اُس زمانہ میں سلطنت فارس
نئی نئی بگڑی تھی۔ کتابیں اہل اسلام کی بہت کم تھیں اور چھاپے کے نہ ہونے کے سبب
جو تھیں سوائے بادشاہی کتب خانہ کے یا کسی امیر کے گھرانے کے نہ ملتی تھیں۔ فقط
پیرمردوں اور پُرانے خاندانوں میں زبانی حوالوں پر داستانیں چلی آتی تھیں۔ فردوسی
ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھ بیٹھ کر واقفیت حاصل کرتا تھا۔ چنانچہ شاہنامہ میں اکثر داستانوں
کے شروع میں اُن کے نام کے حوالے دیتا ہے۔ ان صاحب کمالوں کے حال کتابوں
میں دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس زمانہ میں لوگوں کو عیش و عشرت پھول پان کا
شوق ہے اور پڑھنا لکھنا فقط کمانے کھانے کے لئے سیکھتے ہیں۔ اسی طرح اگلے لوگوں
کو خواہ شہر خواہ دیہات علم و کمال کا عشق دلی ہوتا تھا۔ روزگار کی طرف زیادہ خیال
نہ کرتے تھے۔ دولتِ دنیا کو کچھ مال نہ سمجھتے تھے۔ اگر اسی عالم میں کسی بادشاہ امیر
وزیر سے قسمت موافق ہوگئی تو زہے قسمت۔ نہیں تو تصنیف اور رفاہ خلق اور نام نیک
کو حاصلِ زندگانی سمجھتے تھے۔ اس قسم کے مضامین فردوسی اکثر داستان کے اوّل
یا آخر میں لاتا ہے اور ایسے شوق انگیز طرز پر بیان کرتا ہے کہ دل پر اثر ہوتا ہے۔
دُنیا کی لذّتوں سے طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ غرض یہ فردوس منزل اپنے کمال کے
[دیباچہ شاہنامہ] خیالات میں کہ گویا فارغ البالی کا ملک وسیع ہے عیش کرتا تھا۔ ایک نہر شہر طوس سے
اس کے گاؤں میں آتی تھی۔ اُس کے کنارے پر گزران کے قابل مکان بنا کر سکونت
اختیار کی کیونکہ اُس طرف کے لوگوں کو آب رواں کا بہت شوق ہوتا ہے۔ برسات
میں پانی کی طغیانی سے آبادی کو نقصان پہنچتا تھا۔ دن رات اس فکر میں تھا کہ کسی
طرح اس نہر کا بند پختہ باندھا جائے کہ خلق خدا بربادی سے محفوظ اور نام نیک یادگار

رہے مگر بے مقدوری کے سبب سے کچھ بن نہ آتا تھا - اس کی اور اکثر بزرگوں کی یہ رائے تھی کہ اس کمال خداداد کی بدولت یہ مہم سرانجام ہوگی - بلکہ اس کا شکریہ فردوسی آغاز شاہنامہ میں کرتا ہے - محمد لشکری اس کے ایک دوست نے تاریخ شاہانِ قدیم کی دی کہ اُس میں سے داستان فریدوں وضحاک کی نظم کرکے لوگوں کو سُنائی سب کو پسند آئی - خاص و عام میں شہرہ ہوا - ابومنصور حاکم طوس کو خبر پہنچی - اُس نے بہت قدردانی کی - اور حسب الحکم اُس کی تصنیف میں مصروف ہوا ؎

سی و پنج سال از سرای سپنج ॥ بسے رنج بردم بامید گنج
ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار ॥ کہ گفتم من این نامۂ شاہوار (۸۰×۵)
چو بر باد دادند رنج مرا ॥ نبد حاصلے سی و پنج مرا
کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد ॥ امیدم بیکبارہ بر باد شد

آخر شاہنامہ

چونکہ سنہ ۴۰۰ھ ہجری میں ختم کتاب ہے اور ۳۵ برس میں تصنیف ہوئی یقین ہے کہ کہ اُس وقت سنہ ۳۶۵ھ ہجری ہونگے - اتفاق سے ابومنصور مرگیا - چنانچہ شروع شاہنامہ میں چند شعر اُس کی تعریف اور مرثیہ میں بھی لکھے ہیں - جبکہ سنہ ۳۸۷ھ ہجری میں محمود غزنوی تخت نشین ہوا اور ستارۂ اقبال اُس کا چمکا - اُسے تاریخ عہد قدیم کا شوق تھا شعرائے پایۂ تخت کو فرمائش کی - چونکہ وہ اُس کے سرانجام میں عاجز تھے - لہذا بموجب حکم سلطان یا حاکم طوس کے ظلم سے نالاں ہوکر فردوسی غزنی میں آیا - شعرائے شاہی میں سے عنصری و فرخی و عسجدی باغ میں گلگشت کے لئے آئے تھے اور کنار نہر پر بزم عشرت جمائے بیٹھے تھے - فردوسی بھی اتفاقاً وہاں آنکلا اور انہیں دیکھ کر پاس آن بیٹھا وہ سب امرائے دربار تھے - یہ غریب دہقانی شکستہ حال - اُن کو شریک کرنا اس کا اپنی صحبت میں ناگوار ہوا اور ٹالنے کے لئے کہا کہ ہم تینوں شاعر ہیں اور سوائے شاعر کے غیر شخص کو اپنی صحبت میں شریک نہیں کرتے - اُس نے کہا کیا مضائقہ ہے آپ کچھ ارشاد کریں اگر ہو سکیگا تو میں بھی کچھ کہہ سُناؤنگا نہیں تو داغ ندامت لے کر چلا جاؤنگا - چنانچہ اوّل عنصری

دیباچہ

دولت شاہی

سے نے کہا کہ ع :- چوں عارضِ تو ماہ نباشد روشن

فرخی سے نے کہا کہ ع :- مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی نے کہا کہ ع :- مژگانت ہمیں گزر کند از جوشن

اور تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ دیکھیں اب پیرِ فرتوت کیا کہتے ہیں۔ فردوسی

نے فوراً یہ مصرع پڑھا۔ ع مانند سنانِ گیوٗ در جنگ پشن

سب سُن کر حیران رہ گئے گیوٗ و پشن کا حال پوچھنے لگے۔ اس نے بیان کیا سمجھے کہ یہ شخص علم تاریخ میں کامل ہے۔ ہر علم و فن میں گفتگو ہوئی۔ آخر معلوم ہوا کہ فردوسی یہی ہے۔ عنصری اس کو دربار میں لے گیا۔ چند شعر بادشاہ کی تعریف میں اُسی وقت کہکر پڑھے جو ابتدائے شاہنامہ میں موجود ہیں۔ بادشاہ نے شہر طوس کی بنیاد آبادی کا حال پوچھا۔ فردوسی نے آبادی اُس کی طوس سپہ سالار سائرس بادشاہ ایران کے ہاتھ سے کیفیت مفصّل بیان کی۔ بادشاہ کو اُس کی تاریخ دانی کا یقین کامل ہوا اور چند شعر بموجب فرمائش کے فی البدیہہ اُسی وقت اور بھی کہے۔ جو چند شعر بدیہۃً اُس وقت بادشاہ کی تعریف میں کہے بعض اُس میں سے یہ ہیں ؎

دولت شاہ

ہفت اقلیم و دولت شاہ کا دیباچہ

زبیداں ابر شاہ باد آفریں — کہ نازو باو تخت و تاج و نگیں
جہاندار محمود شاہِ بزرگ — بآبش خور آرد ہمے میش و گرگ
جہاں آفریں تا جہاں آفرید — چو او مرزبانے نیامد پدید
بگیتی بکاں اندر او زر نماند — کہ منشور نام ورا بر نخواند
زکشمیر تا پیش دریاے چیں — براو شہریاراں کنند آفریں
چو کودک لب از شیر مادر بشست — بگہوارہ محمود گوید نخست
بہ بزم اندر او آسمانِ وفا ست — برزم اندرو شیر جنگ آزما ست
بتن ژندہ پیل و بجاں جبرئیل — بکف ابرِ بہمن بدل رودِ نیل

انہیں اشعار پر اگر خیال کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مضامین اور الفاظ سب

جُدا ہیں۔ گل اور بلبل رنگ اور چنگ کے طوطے مینا نہیں۔ کچھ کچھ تو اصلیت کی بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ حکم واسطے تصنیف کتاب کے صادر ہوا اور فی شعر ایک اشرفی انعام مقرر ہوئی۔ الغرض جب ساٹھ ہزار شعر پر کتاب ختم ہوئی۔ بادشاہ کو اطلاع دی گئی حکم ہوا کہ ایک بار فیل اشرفی اس کے صلہ میں مرحمت ہوں۔ حسن میمندی یا ایاز اس امر میں حارج ہوا۔ بادشاہ سے کہا کہ یہ شخص شیعہ ہے۔ چونکہ محمود مذہب کے باب میں نہایت سخت مزاج تھا فوراً قتل کا حکم دیا۔ فردوسی بہت گھبرایا اور غضبناک ہوکر بادشاہی کتابدار سے خفیہ کتاب لی۔ سو شعر بادشاہ کی ہجو میں کہکر اُس پر لکھدئے اور وہاں سے بھاگ کر ہرات میں آیا۔ وہاں کیقباد کی اولاد سے ایک شخص شہریار ابن دارا بادشاہ تھا اُس نے فردوسی کی بہت تعظیم و تکریم کی فردوسی نے اُس سے کہا کہ اس کتاب میں تیرے بزرگوں کا حال ہے۔ تیرے نام پر کردوں مگر اُس نے منع کیا اور لاکھ روپیہ دے کر ہجو مذکور لے لی۔ چونکہ روز منادی و تلاش اُس کی ہوتی تھی اور سلطان ابو العظم کے سامنے کسی کا زور پیش نہ جاتا تھا۔ وہاں بھی گزارہ نہ دیکھا۔ غرض شہر بشہر پھرتا تھا۔ جہاں جاتا حاکم وہاں کے سبب اسکے کمال کے عزت کرتے لیکن محمود کے ڈر سے رکھ نہ سکتے تھے۔ آخر بغداد میں آیا۔ وزیر کی تعریف میں ایک قصیدہ فصیح بزبان عربی کہہ کر لے گیا اور اُس کی معرفت دربار خلیفہ میں پہنچا۔ لیکن چونکہ خلیفہ اور اہل عرب اس بات کا حرف رکھتے تھے کہ اس نے سلاطین عجم کی تعریف کی ہے۔ اس واسطے حضرت یوسفؑ کا قصہ نظم کیا چنانچہ خود کہتا ہے

حکایات آن داستان بس خوش است — سخنہای پاکیزہ و دلکش است
بیا قصہ از قول دادار خوان — کہ بشنایدت مرد بسیار دان
الف لام را تلک آیات را — بخوان ابتدائی حکایات را

لیکن جب محمود کو خبر پہنچی خلیفہ کو نامہ لکھا کہ فردوسی کو گرفتار کرکے بھیج دیجئے نہیں تو بغداد کو ہاتھیوں سے پامال کردونگا۔ وہاں سے اُسی نامہ کی پشت پر جواب آیا

دیباچہ[1]
دولت شاہی[2]
دیباچہ

کہ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ٭ محمود شرمندہ ہو کر خاموش ہو رہا۔ جبکہ فردوسی کی ۶۵ برس کی عمر تھی تو ایک جوان بیٹا اُس کا ۳۷ برس کا مرگیا چنانچہ اُس کا مرثیہ دردانگیز بھی شاہنامہ میں لکھا ہے۔ فردوسی کے جانے کے چند روز بعد محمود کو راجگان ہند سے مہم در پیش ہوئی مراسلہ روانہ کیا۔ ایک دن اسی باب میں مشورہ ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر وہاں سے ہمارے حسب دلخواہ جواب نہ آیا تو کیا تدبیر؟ ایک امیر کی زبان سے یہ شعر فردوسی کا نکلا ؎ (دیباچہ و دولت شاہی)

اگر جز بکامِ من آمد جواب ‖ من و گرز و میدان و افراسیاب

بادشاہ کو سُن کر افسوس آیا اور کہا کہ اس بیچارہ نے ۳۰ برس دماغ سوزی کی۔ افسوس ہے مراد کو نہ پہنچا۔ اُسی وقت ساٹھ ہزار اشرفی اور ایک خلعت گراں بہا روانہ کیا۔ فردوسی بھی اُن دنوں میں ضعیفی کے سبب سے وطن میں آیا ہوا تھا۔ ایک لڑکے کو دیکھا سرِ راہ پڑھتا چلا جاتا ہے ؎

اگر شاہ را شاہ بودے پدر ‖ بسر بر نہادے مرا تاج زر

اس شعر نے زخمِ دل پر نمک کا کام کیا۔ سب اگلی پچھلی باتیں یاد آگئیں اور باغ غزنی کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ محرومی و مایوسی دل پر اس قدر چھائی کہ رقت آگئی اور زمین پر گر پڑا۔ اسی برس کی عمر تھی۔ گھر میں جاکر بیمار ہوا اور چند روز میں مرگیا۔ اتفاق زمانہ دیکھنا چاہیئے کہ جس وقت معتبرانِ شاہی مع خلعت و خزانہ شہر میں داخل ہوئے تھے اُسی وقت فردوسی کا جنازہ شہر سے نکلتا تھا۔ اُن لوگوں کو یہ حال معلوم ہوا۔ بہت متاسف ہوئے فردوسی کے گھر آئے۔ معلوم ہوا کہ ایک بیٹی باقی ہے۔ اسے حال کہلا بھیجا۔ اُس نے کہا کہ جس روپیہ سے میرا باپ ناکام گیا اُس کا لینا مجھ ناشاد کو بھی منظور نہیں۔ معتبران شاہی نے یہی تقریر بادشاہ کو لکھ بھیجی۔ بادشاہ اور تمام ارکان دولت حیران رہ گئے۔ لڑکی کی ہمت عالی پر تحسین و آفرین کی اور اُس روپیہ سے نہر طوس کا بند تعمیر کرادیا کہ اب تک بند فرخ مشہور ہے حکیم ناصر خسرو (دیباچہ شاہنامہ)

اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ ۴۳۸ھ میں طوس کی طرف میرا گزر ہوا۔ ایک عمارت عظیم نہایت دلچسپ نظر آئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جو روپیہ فردوسی کے وارثوں نے نہ لیا تھا اُس سے یہ تعمیر ہوئی ہے۔ مولوی جامی کا ایک شعر اس مضمون پر نہایت برجستہ معلوم ہوا چنانچہ لکھا جاتا ہے ؎

گزشت قصۂ محمود و در زمانہ نماند	جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدر فردوسی

دیباچہ دولت شاہی

شیخ ابوالقاسم گرگانی ایک بڑے عالم اُس زمانہ میں تھے۔ انہوں نے فردوسی کے جنازہ کی نماز نہ پڑھی کہ اس نے بادشاہان عجم کی تعریفوں میں عمر ضائع کی ہے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ فردوسی ایک خلعت سبز پہنے تاج زمرد سر پر رکھے ایک محل عالیشان میں بیٹھا ہے۔ پوچھا کہ یہ رتبۂ عالی تم کو کیونکر حاصل ہوا؟ جواب دیا کہ درگاہ بے نیاز ذرّہ نواز ہے۔ یہ میرے شاہنامہ کے دو شعروں کا صلہ ہے ؎

ستایش کنم ایزدِ پاک را	کہ گویا و بینا کند خاک را
بمورے دہد مالشِ نرہ شیر	کند پشّہ بر پیلِ جنگی دلیر

خوبی یہ ہے کہ اس کے کلام سے طرفداریٔ مذہبی یا تعصّب دلی نہیں پایا جاتا جو مضمون خیال میں آتا ہے صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ چنانچہ جنگ اسلام میں ساتھ اہل فارس کے جو یزدجرد کی طرف سے نامہ بنام سعد ابن ابی وقاص لکھتا ہے کہتا ہے ؎

ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کند آرزو	تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو
شمارا بدیدہ دروں شرم نیست	ز راہِ خرد مہر و آزرم نیست
بدیں چہر و ایں مہر و ایں روئے و خو	ہمیں تخت و تاج آیدت آرزو

اگرچہ بات واقعی ہے زبانی یزدجرد کے ہے۔ لیکن ایسی بات اپنی زبان سے کہنی لوگ بے ادبی مذہب کی جانتے ہیں۔ بہرحال بنائے کلام اس پہلوان فن اور مرد میدانِ سخن کی بہادری اور شجاعت اور پند و نصیحت۔ عقل و حکمت اور علو ہمّت پر

ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر طبیعت میں آزادی اور دل میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سیف زبان اگر حسن کی تعریف میں بھی زبان آوری کرتا ہے تو شجاعت کے ضلع کو نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ رستم کی بی بی کی تعریف میں کہتا ہے ؎

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند　　زبانش چو خنجر دہانش چو قند

شعرائے فارس کی فصاحت و نازک خیالی مضمون عشق پر منحصر ہے لیکن اس کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کے آئینۂ دل میں یہ عکس بالکل نہ پڑا تھا اور طبیعت حکیمانہ میں اس قسم کے خیال گویا پیدا ہی نہ ہوتے تھے۔ باوجود اس قدر پرگوئی اور آمد مضامین کے جہاں چاہتا ہے کلام کو ایسا مختصر کرتا ہے کہ اُس سے زیادہ نہیں ہوسکتا چنانچہ ایک جگہ جلسۂ مشورت و اجتماع اہل دانش و برخاست محفل کے باب میں کہتا ہے ؎

چو از تیرہ شب بہرۂ درگذشت　　شب آہنگ بر چرخ چارم گذشت
پئے مصلحت مجلس آراستند　　نشستند و گفتند و برخاستند

عوام النّاس میں مشہور ہے کہ فردوسی اتنی بڑی کتاب میں ایک لفظ عربی کا نہیں لایا۔ یہ غلط ہے البتّہ کم استعمال کیا ہے۔ کل اہل تذکرہ و تاریخ لکھتے ہیں اور یہ درست ہے کہ مثل اور شاعروں کے غزلیں اور قصاید وغیرہ فردوسی نے نہیں کہے لیکن تذکرہ مرات الخیال میں جو لکھا ہے کہ سوائے شاہنامہ کے کوئی اور نظم اُس کی نہیں۔ یہ غلط ہے کیونکہ قصّۂ حضرت یوسف راقم نے بچشم خود دیکھا ہے۔ اس کتاب کے ۴۰۰ صفحہ جس میں فی صفحہ ۱۶ سطریں ہیں دو قطعہ جو تاریخ ہفت اقلیم میں دیکھے گئے اہل اخلاق کے لئے تحفۂ دلکش ہیں ؎

فلک گر بزیر نقاب اندر است　　وگر زیر پرّ عقاب اندر است
سپندار کو از پئے کار تو　　بہ بند خطا و ثواب اندر است
اگر بدکنی کیفر خود بری　　نہ چشم زمانہ بخواب اندر است
بر ایوان ہا نام بیژن ہنوز　　بزندان افراسیاب اندر است

ایضاً

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم　　ز گفتارِ تازی و از پہلوانی
بہ چندیں ہنر شصت و دو سال بودم　　کہ گوشہ برم زاشکار و نہانی
بجز حسرت و جز وبالِ گناہاں　　ندارم کنوں از جوانی نشانی
بیادِ جوانی کنوں مویہ آرم　　بدیں بیت بُو طاہرِ خسروانی
جوانی من از کودکی یاد دارم　　دریغا جوانی دریغا جوانی

۵ بیا بگوے کہ پرویز از زمانہ چہ بُرد　　برو بپرس کہ کسریٰ ز روزگار چہ خورد
گر او گرفت ممالک بدیگراں بگزاشت　　ور ایں نہاد خزائن بدیگراں بسپرد

رباعی

تا چند نہی بر دلِ خود غصّہ و درد　　تا جمع کنی سیمِ سفید و زرِ زرد
زاں پیش کہ گردد نفسِ گرمِ تو سرد　　با دوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد

اکثر اشعار اس کے سنجیدگیٔ کلام اور اختصارِ الفاظ کے سبب ضرب المثل روزگار ہیں سعدی جیسا نصیحت گر نامور اپنے کلام میں سند لایا ہے ۵

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد　　کہ رحمت بران تربتِ پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است　　کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است　　بوستان

اشعارِ نصیحتانہ و بے بقائے زمانہ شاہنامہ میں بہت ہیں ہر جگہ کبھی بطورِ تمہید اور کبھی نتیجۂ کلام کے لئے لاتا ہے بعض اُن میں سے بطریقِ مشتے نمونہ از خروارے نقل کئے جاتے ہیں کہ بروقت گفتگو نمک تقریر ہیں ؂

ترغیبِ نیکوکاری

فریدونِ فرّخ فرشتہ نبود　　ز عود و ز عنبر سرشتہ نبود
ز داد و دہش یافت ایں نیکوی　　تو داد و دہش کن فریدوں توئی

درباب بے اختیاری حال و قدرت پروردگار

ندانم کہ پروردگارِ جہاں　　دریں آشکارا چہ دارد نہاں

در باب قدرت عالم الغیب

نداند بجز داورِ کردگار — کہ فردا چہ بازی کند روزگار

تقدیرِ الٰہی و مغلوبیٔ تدبیر

قضا چوں ز گردوں فرو ہشت پر — ہمہ عاقلاں کور گردند و کر

٥ اگر تیغ عالم بجنبد ز جا — نہ بُرّد رگے تا نخواہد خدا

نصیحت

نہ بینی کہ عیسیٔ مریم چہ گفت — بدانگہ کہ بکشاد رازِ نہفت

کہ پیراہنت گر ستاند کسے — میاویز با وے بہ تندی بسے

وگر بر زند کف برخسارِ تو — شود تیرہ از درد رخسارِ تو

میاور بخشم و مکن روے زرد — بخواباں تو خشم و مکن بیچ سرد

بہ کمتر خورش بس کن از خوردنی — مجوے ارنباشدت گستردنی

بدنیا بدی را بدی مشمرید — بے آزار ازیں تیرگی بگذرید

رزمیہ مقابلۂ رستم و اشکبوس کشانی

تہمتن بہ بند کمر بُرد چنگ — گزیں کرد یک تیرہ چوب خدنگ

خدنگے بر آورد پیکاں چو آب — نہادہ برو چار پرّ عقاب

بمالید چاچی کماں را بدست — بچرم گوزن اندر آورد شست

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست — خروش از خم چرخ چاچی بخاست

چو سوفارش آمد بہ پہنائے گوش — ز چرم گوزناں بر آمد خروش

چو بوسید پیکاں سر انگشتِ او — گزر کرد از مہرۂ پشت او

قضا گفت گیر و قدر گفت دہ — ملک گفت احسن فلک گفت زہ

کشانی ہم اندر زماں جاں بداد — تو گوئی کہ از پشتِ مادر نزاد

بہت باتیں لوگوں نے کہانیوں کی طرح بنا رکھی ہیں بلکہ کتابوں میں لکھی ہیں - اگرچہ

لائق اعتبار نہیں لیکن چونکہ مؤلف کو لازم ہے جو حال یا لوگوں کا خیال معلوم ہو سب پر ظاہر کرے اور اُس کے جھوٹ اور سچ پر رائے دے اس واسطے بطور لطیفہ کے لکھا جاتا ہے کہ جب فردوسی نے اشعار مذکورہ لکھے رستم نے خواب میں بہت شکریہ اس کا کیا اور کہا کہ اس حالت میں اور کچھ خدمت تو نہیں ہو سکتی لیکن فلانی جگہ میرے گھوڑے کی زنجیر طلائی گڑی ہوئی ہے آپ نکال لیجئے اور بعضے کہتے ہیں کہ جب فردوسی دربار محمود سے محروم ہوا تو رستم پر بھی خفا ہوا۔ چند شعر اُس کی ہجو میں لکھے ایک اُس میں سے یہ ہے ؎

منش کردہ ام رستم داستاں	وگرنہ یلے بود در سیستاں

اُس وقت رستم خواب میں آیا اور یہ خزانۂ غیب بتایا۔

نظامی نے جو شاہنامہ پر سکندر نامہ کہا ہے فرق یہ ہے کہ فردوسی کے مضامین بلند الفاظ زبردست ترکیب چست اور محاورہ صاف روزمرّہ ہے۔ اور نظامی مضامین کو سنبل و نسرین سے رنگین اور مشک و عنبر سے معطر کرتا ہے۔ غرض ۴۱۱ھ ہجری میں یا بموجب تحریر طبقات اکبری کے ۴۱۵ھ ہجری میں فردوسی راہئ عدم ہوا۔ محمود کی ہجو میں ۱۲۰ اشعر جو فردوسی نے کہے چند شعر منتخب لکھے جاتے ہیں:۔

منتخب اشعار ہجو محمود

ایا شاہ محمود کشور کشاے	زمن گر نہ ترسی بترس از خداے
کہ بے دین و بدکیش خواندی مرا	منم شیر نر میش خواندی مرا
مرا سہم دادی کہ در پاے پیل	تنت را بسازم چو دریاے نیل
نہ ترسم کہ دارم ز روشن دلی	بدل مہر آل نبیؐ و علی
اگر در تہِ پاے پیلم کنی	تن ناتواں ہمچو نیلم کنی
بریں زادہ ام ہم بریں بگذرم	ثنا گوے پیغمبر و حیدرم
بسے رنج بردم دریں سال سی	عجم زندہ کردم بدیں پارسی

دولتشا

جہاں از سخن کردہ ام چوں بہشت   کزیں پیش تخمِ سخن کس نکشت
بسے تاجداران و گردن کشاں   کہ دادم یکایک ازیشاں نشاں
ہمہ مردہ از روزگارِ دراز   شد از گفتِ من نامِ شاں زندہ باز
چو عیسیٰ من آں مردگاں را تمام   سراسر ہمہ زندہ کردم بنام
یکے بندگی کردم اے شہریار   کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بیفگندم از نظم کاخ بلند   کہ از باد و باراں نیابد گزند
نہ ایں گونہ دادی مرا تو نوید   نہ ایں بودم از شاہ گیتی اُمید
بداں شہریارا کہ ایں روزگار   نماند بسے بر کسے یادگار
بترس از خدا و میازار کس   رہِ رستگاری ہمین است و بس
بداندیش کش روز نیکی مباد   سخنہائے نیکم بہ بد کرد یاد
بر پادشہ پیکرم زشت کرد   فروزندہ اختر چو انگشت کرد
بدانش نبود شاہ را دستگاہ   وگرنہ مرا برنشاندے بگاہ
اگر شاہ را شاہ بودے پدر   بسر بر نہادے مرا تاجِ زر
اگر مادرِ شاہ بانو بُدے   مرا سیم و زر تا بزانو بُدے
چو اندر تبارش بزرگی نبود   نیارست نامِ بزرگاں شنود
نہ خسرو نژادے نہ والا سرے   پدر ز اصفہاں بود آہنگرے
پرستار زادہ نیاید بکار   اگرچہ بود زادۂ شہریار
ز بد اصل چشمِ بہی داشتن   بود خاک در دیدہ انباشتن
جہاں را چنین است آئین و ساز   کہ سازد فرومایہ را سرفراز
سرِ ناسزایاں برافراشتن   وزایشاں امیدِ بہی داشتن
سرِ رشتۂ خویش گم کردن است   بجیب اندروں مار پروردن است
درختے کہ تلخ است وبرا سرشت   گرش در نشانی بباغِ بہشت

ور از جوئے خلدش بہنگام آب ‌ ‌ بہ بیخ انگبیں ریزی وشہد ناب
سرانجام گوہر بکار آورد ‌ ‌ ہماں میوۂ تلخ بار آورد
بہ عنبر فروشاں اگر بگزری ‌ ‌ شود جامہ ات سر بسر عنبری
وگر بگزری سوے انگشت گر ‌ ‌ ازو جز سیاہی نیابی دگر
ز بدگوہراں بد نباشد عجب ‌ ‌ نشاید سیاہی ستردن ز شب
ز ناپاک زادہ مدارید امید ‌ ‌ کہ زنگی بشستن نگردد سفید
بزرگی سراسر بگفتار نیست ‌ ‌ کہ صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

سکندر لک حاکم قہستان فردوسی سے شناسائی رکھتا تھا اُس نے بہت روپیہ اُسے بھیجا اور یہ ہجو مانگی کہ اسے نیست و نابود کردے فردوسی نے بھیج دی اور چند اشعار ساتھ اُس کے بھیجے کہ ؎

بہ غزنیں مرا گرچہ خوں شد جگر ‌ ‌ ز بیداد آں شاہ بیداد گر
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام ‌ ‌ شنید آسماں از زمیں نالہ ام
ہمیں خواستم تا فغاں ہا کنم ‌ ‌ بگیتی ازاں داستاں ہا کنم
بگویم ز مادرش و نیز از پدرش ‌ ‌ نترسم زکس جز خداوند عرش
کنم آنچناں روسیہ از نخست ‌ ‌ کہ نتواند آنرا بہ ہیچ آب شست
چو دشمن نبیداند از دوست باز ‌ ‌ بہ بیخ زبانش کشم پوست باز
ولیکن بفرمودۂ محتشم ‌ ‌ ندانم کزیں بیش چوں سرکشم
فرستادم ار گفتہ داشتم ‌ ‌ بہ نزدیک خود ہیچ نگذاشتم
اگر باشد ایں گفتہا ناصواب ‌ ‌ بسوزش بآتش بشویاں بآب
گذشتم ازاں سرور نیک رائے ‌ ‌ ازیں داورے تا بدیگر سرائے
رسد لطف یزداں بفریاد من ‌ ‌ ستاند بحشر ازو داد من

ایک قطعہ اس سے اور بھی منقول ہے - دل ہی تو ہے شاید لکھتے لکھتے یہ بھی

خیال آگیا ہو۔ قطعہ

خجستہ درگہِ محمود زابلی دریاست	چگونہ دریا کا نرا کنارہ پیدا نیست
شدم بدریا غوطہ زدم ندیدم در	گناہ بختِ من است ایں گناہ دریا نیست

عبدالقادر بدایونی اس قطعہ کو نقل کرکے کہتا ہے کہ ماں محمود کی زابلی تھی۔ اور بعض لوگوں کا یہ قول ہے کہ زابل عہد قدیم میں قندھار کو کہتے تھے ؞

ابوالفضل اکبرنامہ میں اگرچہ شاہنامہ کی جیسی چاہئے تعریف کرتا ہے۔ لیکن اُس میں اپنے فخریہ اور فردوسی کی ملامت میں چند فقرہ نہایت چست بلکہ سخت و درشت بھی لکھتا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ فردوسی کمینہ بے وقوف سخن فروش زر پرست تھا۔ قول ابوالفضل کا کہ اشارہ طرف ہجو مذکورۂ بالا کے ہے درست ہے اور فخریہ بھی بجا ہے۔ لیکن مقام انصاف ہے کہ وہ اور اُس کا خاندان مرحمت اکبر سے ہندوستان کے مالک بنے ہوئے بیٹھے تھے بلکہ خود تباہی اور خانہ بربادی سے نجات پائی تھی چنانچہ اُس کے حال سے آئندہ مفصل معلوم ہوگا بیشک جو عقیدت ظاہر کریں بجا ہے لیکن جب ۳۰ برس کی محنت اسی برس کی عمر میں برباد ہوئی اور اُس بڑھاپے میں خوف جان سے شہر بشہر دشت بدشت سرگرداں پھرتے اُس وقت دیکھئے کہ ان کی زبان سے کیا حق نمک ادا ہوتا ؞

شاہنامہ

اب مختصر حال کتاب شاہنامہ کا لکھتا ہوں کہ بایسنغر مرزا امیر تیمور کے پوتے نے اس کتاب کے بہت نسخہ جمع کرکے ایک نسخہ مکمّل تیار کیا اور فضلاے وقت نے اُس پر دیباچہ لگایا۔ اُس سے واضح ہوتا ہے کہ نوشیروان کو ساتھ عدالت وسخاوت کے ذوق علوم وفنون و تواریخ کا بھی تھا۔ اہل علم کو جو جو حال شاہان قدیم کا تحقیق ہوتا تھا لکھ کر کتب خانہ میں داخل کرتے تھے۔ یزدجرد کے عہد تک بھی

سلسلہ جاری تھا۔ ایک دہقان پیر ساکن شہر مدائن حالات اور واقعات سلاطین سلف سے اُس وقت میں بہت واقفیت رکھتا تھا بموجب حکم یزدجرد اُس نے نوشتہ ہائے مذکورہ سے انتخاب کرکے ایک کتاب جامع تالیف کی۔ یہاں تک تو تقریبہ قرین قیاس تھی۔ افسانہ فضولی یعنی جانا کتاب کا عرب میں اور وہاں سے پھر آنا فارس میں قرین قیاس نہ تھا۔ اس واسطے تفصیل اُس کی ترک کرکے لکھا جاتا ہے کہ سلطنت سامانیہ میں سنہ ۳۶۶ ہجری میں تصنیف شاہنامہ شروع ہوئی۔ دقیقی شاعر نے ہزار شعر کہے تھے کہ بسبب کسی حرکت ناشایستہ[1] کے اپنے غلام کے ہاتھ سے مارا گیا اور یہ مہم ناتمام رہی۔ جب محمود بادشاہ ہوا اور معرفت خور[2] فروز کے یا کسی اور طریقہ سے وہ مجموعہ ہاتھ آیا تو انجام کو فردوسی کی زبان وقلم سے تمام ہوا۔ اگرچہ اس کتاب کے ۶۰ ہزار شعر مشہور ہیں۔ لیکن تارن صاحب نے ۲۲ نسخہ نہایت سندی قدیمی جمع کرکے بعد مقابلہ کے ایک کتاب کلکتہ میں چھپوائی تھی۔ اُس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو نسخہ زیادہ سے زیادہ تھا اُس میں ۵۶ ہزار ایک سو کئی شعر تھے۔ محمد عوفی لکھتا ہے کہ ۲۰ ہزار شعر شاہنامہ کے دقیقی کی تصنیف ہیں اور ۶۰ ہزار فردوسی کے۔ اور تقی کاشی کہتا ہے کہ ۴ ہزار شعر اُس کے استاد اسدی طوسی کے ہیں کہ اُس نے فردوسی کو مرض موت میں کہکر دئے تھے۔ اُس کی تصنیف اُس زمانہ سے شروع ہوئی جبکہ اہل عرب نے ایران پر حملہ کیا۔ اسدی نے گرشاسپ نامہ بھی تصنیف کیا ہے اور اکثر قصاید اور مباحثہ شب و روز اور جہل و علم وغیرہ کے بھی ہیں۔ دقیقی کا نام منصور ابن احمد تھا۔ وطن اُس کا بخارا تھا۔ اُس نے نوح بن منصور کے حکم سے گشتاسپ نامہ بھی تصنیف کیا تھا۔ نوح مذکور سنہ ۳۸۶ ہجری میں تخت سے معزول ہوا۔ ابتدا شاہنامہ کی اُس نے کی تھی۔ وہ بدکار اپنے غلام کی شمشیر سے قتل ہوا۔ چنانچہ شاہنامہ کی ابتدا میں فردوسی بھی اس کا اشارہ کرتا ہے۔ یہ کتاب براے نام تاریخ مشہور ہے

مفتاح و ہفت اقلیم دیباچہ

۱؎ آغاز شاہنامہ
۲؎ ہفت اقلیم

لیکن درحقیقت اس کو ایک افسانہ زبان فارسی کا سمجھنا چاہیئے جو کہ تاریخ کی طرز پر لکھی گئی چنانچہ سلطنت کیخسرو میں کئی جگہ لکھا ہے کہ آتشکدہ میں گیا اور ژندوستا کی آرایش اور تعظیم کی اور اس میں شک نہیں کہ ژندوستا اُس کے پوتے کے وقت میں زردشت نے ترتیب کی جس میں قریب دوسو برس کا فرق ہے۔ ابتدائے لشکرکشیٔ سکندر اور پھر اور مقامات میں کہتا ہے کہ نشان یعنی لشکر کا علم طلب کیا۔ اُس کے پھریرے پر صحب الصلیب لکھا تھا اور دین مسیح کی قسم کھائی پس یہ بھی ظاہر ہے کہ سکندر ۳ سو برس پہلے حضرت عیسے سے مرگیا تھا۔ باوجودیکہ سلطنت سکندر و بہرام گور و نوشیروان وغیرہ میں کئی جگہ مفصل ذکر ہندوستان کا آیا ہے۔ لیکن سوائے نام قنوج و سند و جادوستان کے کسی شہر کا نام نہیں آیا۔ اس سے زبان مذکور کے علم جغرافیہ کا ضعف پایا جاتا ہے۔ ملک جادوستان کی تحقیق نہیں ہوئی مگر اُس زمانہ میں جدو بنسوں کا خاندان مشہور تھا عجب نہیں کہ ولایتی مورّخوں نے سُن کر اُن کے ملک کو جادوستان لکھنا شروع کردیا ہو۔ اسی طرح سے بعض داستانوں میں حوالہ شاہوے پیر کا دیتا ہے۔ یہاں کے کسی آنے والے سے سُنا ہوگا کہ ہند میں ساہ مہاجن بڑے آدمی کو کہتے ہیں۔ اُس نے سمجھا کہ سب طرح کی بڑائیاں اور فضل و کمال اُسی میں ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم لوگوں میں تاریخ سلف کی بالکل نہیں ہے اس واسطے اسی کو غنیمت سمجھکر مطلب براری کرنی چاہیئے۔ گو کہ سکندر کا آنا ہندوستان میں غلط ہے لیکن چونکہ بعض عمل اور ایجادات عجیب اُس وقت کے حکیموں کے لکھے ہیں۔ اس سے بھی اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان ادویات و نباتات و حکیموں کے باب میں اُس زمانہ میں بھی مشہور تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں عیش و عشرت کا مرض قدیمی ہے چنانچہ بہرام گور نے شنگل راجہ ہندوستان سے (جو کہ اُس کا خسر تھا) مطرب اور ارباب نشاط طلب کیئے۔ چنانچہ اُس نے دو ہزار سے زیادہ صاحب کمال

اس فن کے مع ساز و سامان یہاں سے بھیجے ۔ آنا حکیم برزویہ کا نوشیروان کی طرف سے برائے تحقیقات نباتات و دوائے زندگی بخش و تلاش کوہستان ہند میں اور یہاں سے جانا کتاب کلیلہ دمنہ اور شطرنج کا بھی ثابت ہوتا ہے ۔

اے ناظرین یہ مٹی وہی علم خیز اور مادہ قابل اور حکمت انگیز ہے۔ اس وقت کو غنیمت جانو کہ معلم و حاکم تمہارے دانایان فرنگ فخر حکماے فارس و یونان ہیں۔ انکی آبیاریِ تعلیم و پرورش مثل ابر رحمت کے جاری ہے اور تم میں دونو جوہر حکمت و صنعت کے موجود ہیں کوشش اور محنت سے زنگِ جہالت کو دور کرو کہ مراد دلی تمہاری حاصل ہو تم دونو جہان میں سرسبز ہو اور نام نیک تمہارے بزرگوں کا روشن ہو ۔

حکیم ناصِر خسرو

تمام اہل تذکرہ و تاریخ کے اقوال اس کے باب میں مختلف ہیں کوئی کہتا ہے عارف اور موحد کامل تھا۔ کوئی کہتا ہے ملحد تھا اور تناسخ کا قائل تھا لیکن ایک رسالہ خود اس کی تصنیف سے میرے ہاتھ آیا۔ سب کے کلام لغو سمجھ کر اُس کا خلاصہ لکھتا ہوں ۔ یہ رسالہ بدخشاں میں دیکھا گیا۔ ترجمہ اس رسالہ کا اور تاریخ ہفت اقلیم میں بھی خلاصہ اُس کا مندرج ہے :-

" ابو المعین ناصر ابن خسرو ابن حارث ابن علی ابن حسین ابن علی ابن موسی الرضا؂ مجھ کو بچپن سے علم و کمال کا شوق تھا ۔ ۹ برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ پانچ برس میں علم لغت و صرف و نحو و عروض و قافیہ و حساب و سیاق تحصیل کیا ۔ بعد اس کے رمل نجوم ہیئت اقلیدس حاصل کیا ۔ اکتساب علوم اور تحقیقات مختلف کے لئے ۳۰ برس بصرہ اور روم و یونان و ہند

اور بابل میں سیاحی کی۔ بعد اسکے فقہ و حدیث کتب متداولہ اور تفاسیر و تواریخ میں سو سو جلد کتابوں کی پندرہ برس تک دیکھیں۔ مذاہب مختلفہ کی کتابیں اور تصنیفات مذہب جاماسپ حکیم و منطق الٰہی و طبیعی و قانون اعظم و ریاضات و تسخیرات و اختلاف حکمائے اوّلین و آخرین کے سب معلوم کئے۔ مسائل مشکل کو حل کیا۔ ۶۰ برس کی عمر ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اب کوئی کتاب قابل سیر باقی نہ رہی ہوگی۔ چند روز میں عزیز مصر کا وزیر ہوگیا۔ مگر چند مسئلوں میں علمائے نافہم سے مباحثہ ہوا جو اکابر فضلا مشہور تھے اُنہیں دلائل عقل و نقل سے قائل کیا۔ اُنھوں نے بغض و حسد سے میری تکفیر عزیز کے دلنشین کی۔ میرے ایک معتقد نے مجھے بھی خبر دی۔ مَیں سعید اپنے رازدان بھائی کو ساتھ لے کر بھاگا۔ بغداد میں مستنصر باللہ کے پاس آیا۔ چند روز میں وزیر ہوگیا۔ مگر وہاں بھی وہی خرابیاں پیش آنے لگیں۔ چند روز بعد مع بھائی کے واسطے لینے بیعت کے ملاحدہ کے ملک میں بھیجا گیا۔ وہاں کا حاکم غائبانہ میرا اشتاق تھا۔ میں نے خلیفہ کا پیغام ادا کیا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ اُس نے نام پوچھا۔ میں نے کہا ناصر۔ اُس نے کہا کیا تو ناصر پسر خسرو ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ وہ مرد حکیم ہے مجھے اُس سے کیا نسبت۔ اُس نے کہا کہ تو بھی عالم دانا معلوم ہوتا ہے۔ چاہئے کہ تیرے علم و حکمت سے کچھ فائدہ حاصل کیا جائے۔ ایک کتاب منگا کر دی کہ یہ اُسی کی تصنیف ہے اور یہاں کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ میں نے دیکھا تو کتاب اکسیر اعظم میری تصنیف تھی۔ بحث واجب الوجود کے مطالب میں نے بیان کرنے شروع کئے۔ اتنے میں ایک شخص دربار میں حاضر ہوا۔ سلام کیا اور بیہوش ہوکر گر پڑا۔ میں نے دیکھا تو ناطوس مغربی تھا کہ بابل میں مجھ سے پڑھا کرتا تھا۔ جب ہوش آیا تو حاکم نے اُس سے پوچھا کہ تو اس شخص کو پہچانتا ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں ناصر خسرو میرا اُستاد ہے۔ حاکم سُنتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ نہایت تعظیم سے پیش آیا اور کہا الحمدللہ آج طالب کو مطلوب ملا۔ غرض جب پیغام سلام خلیفہ کے طے ہوئے میں نے رخصت

چاہی اُس نے ہرگز نہ مانا اور مستنصر کے خط کو جو میری طلب میں تھا چاک کر ڈالا۔ مجھے وزارت دے دی۔ میں نے انکار کیا۔ جب کسی طرح مخلصی نہ دیکھی ناچار قبول کیا۔ تمام سلطنت مجھے اور سعید کو سپرد کر دی۔ اس پر بھی میں ہمیشہ گھات میں رہتا تھا آخر ایک دن موقع پا کر بھاگا لیکن پھر گرفتار ہو کر آیا۔ حاکم نے کہا کہ اے ناصر مجھے تو یہی آرزو تھی کہ ایک دفعہ تجھے خواب میں دیکھوں۔ اب تو خدا نے جیتے جاگتے یہ دولت دی بے مرنے کے خلاصی محال ہے۔ آخر زنجیریں ہاتھ پاؤں میں ڈال کر قید کیا ۹ سال محبوس رہا۔ حاکم کا ایک بیٹا تھا کہ وہ اس عرصہ میں میرا شاگرد رہا تھا اور کچھ حاصل بھی کیا تھا اُس نے کہا کہ اب رہائی اسی میں ہے کہ میرے باپ کے مذہب کے بموجب ایک کتاب تصنیف کر۔ ناچار جان بچانے کے لئے بموجب اُن کے مذہب کے ایک کتاب لکھی اور وہی زیادہ تر مانع خلاصی ہوئی۔ خدا جانتا ہے کہ وہ میرا اعتقاد نہیں لیکن عالم میں مشہور ہو گئی۔ علما فضلا نے دیکھی اور کافر ٹھیرا دیا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے اُس کی وزارت تک منظور نہ تھی۔ لاچار پھنس گیا تھا۔ آخر بھائی نے کہا کہ علم تسخیرات[1] اور طلسمات میں تجھے دخل ہے۔ عالم ارواح سے کوئی رستہ نکال کہ اس بلا سے مخلصی ہو۔ میں ایک دن حاکم کے پاس گیا اور کہا کہ میں تو اب بڑھاپے سے لب گور پہنچا مجھے قید سے رہائی دو۔ میرے عوض بھائی کو قید کر لو اُسے بھی رحم آیا اور زنجیریں کٹوا دیں۔ میں اعمال تسخیر میں مشغول ہوا۔ اُس کی تاثیر سے حاکم بیمار ہوا۔ مجھے بُلایا۔ میں نے کہا کہ سرزمین دمشق میں ایک گھاس ہے۔ اُس کے سوا کوئی دوا نہیں۔ چنانچہ مع بھائی کے اُس کی تلاش میں روانہ ہوا۔ پچاس سپاہی کا پہرہ ہمارے ساتھ تھا۔ ۱۳ منزل آگے جا کر میں نے ایک ایسا عمل کیا کہ سب لوگ اور اُن کے گھوڑے وغیرہ جل کر خاک ہو گئے۔ سعید اور ایک شاگرد کو لیکر نیشا پور میں آیا۔ جوتی ٹوٹ گئی تھی میں موچی کی دوکان پر گٹھوانے گیا۔ دفعتہً ایک غل ہوا۔ موچی بھی بھاگا ہوا گیا۔ دیکھوں تو سامنے سے بھائی اکیلا چلا آتا ہے اور موچی اپنے درفش پر ایک گوشت کی بوٹی لئے آتا ہے۔ حال پوچھا تو موچی نے کہا کہ ناصر خسرو کا ایک شاگرد

کسی عالم سے مباحثہ کرتا تھا۔ عالموں نے ترویج دین کے لئے اُسے قتل کیا۔ سب
ایک ایک بوٹی تبرّک کی طرح لے گئے۔ مَیں سنتے ہی اپنی جوتی لیکر بھاگا کہ جہاں میرے
نام کے سبب سے شاگرد کا یہ حال ہوا میرا کیا ٹھکانا ہے۔ بدخشاں میں آیا۔ وہاں بھی
دو سال وزارت کی۔ یہاں کے لوگ مسلمان صاحب مروۃ تھے البتہ بعضے عالم منصب
دعوے کرتے تھے لیکن ایمان سے بے بہرہ تھے وہ البتہ بہتان طوفان لیتے تھے اُن سے
دل پریشان ہوا۔ قصبہ یمگان علاقۂ بدخشاں میں گیا۔ وہاں کے لوگ بہت گرویدہ ہوئے
لیکن حاسدوں کے ڈر سے یہ غار اختیار کیا اور طلسمات کے بندوبست باندھے کہ
لوگوں کی ملاقات بلکہ اُن کی نظر سے محفوظ رہوں۔ ۲۳ برس یہاں خدائے واحد کی
عبادت کی۔ اب یہ عالم ہے کہ کھانے کی فقط بُو مجھے کافی ہے ۲۵ دن میں ایک دفعہ
کھانا کھاتا ہوں ۱۴۰ برس کی عمر ہوئی زندگی آخر ہے کچھ آرزو باقی نہیں عقل میں
فرق آگیا۔ عبادت بھی اب نہیں ہوسکتی۔ بھائی سعید کل جمعہ کا دن ۱۲ ربیع الاوّل
کی ہوگی۔ سوائے فرشتگان اعمال کے کوئی نگاہبان نہ ہوگا اور سوائے پروردگار عالم
کے کوئی غمگسار نہ ہوگا۔ روح میرے بدن سے ساتھ ایمان کے جدا ہوگی انشاءاللہ تعالیٰ
تجھے چاہئے کہ جب تک مجھے غسل نہ دے علما و حکما و عوام النّاس سے کسی کو خبر نہ کرے
جب غسل دینے لگیگا تو دو شخص علما عالم ارواح سے حاضر ہونگے تُو اُنہیں مانع نہ ہونا کہ
وہ تیری مدد کو آئینگے۔ جب قبر وغیرہ تیار ہو چکے تو جا کر علما کو خبر کرنا۔ جب سب حاضر
ہوں تو خود پیش نماز ہو کر نماز پڑھانا اور بعد نماز کے عذر معذرت کرنا جب وہ چلے
جائیں تو دفن کر دینا۔ اور کہنا بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰی مِلَّتِ رَسُوْلُ اللّٰهِ
یعنی اللہ کے نام اور اللہ کی برکت سے اور اوپر مذہب اللہ کے رسول کے یا اللہ
تیرے بندۂ گنہگار کو لایا ہوں اُس پر رحمت کر۔ پھر اس غار میں نہ ٹھیرنا۔ جب
نکلنے لگے تو یہ شیشہ اُٹھا لینا اس میں تھوڑا پانی ہے اُسے غار کے دروازے
پر چھڑک دینا اور مجھے خدا کو سونپ دینا۔ فقط" بھائی اُس کا کہنا ہے کہ

دوسرے دن ایسا ہی ہوا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دو شخص آئے اور میں نے اُنکے ساتھ کفن دفن کیا۔ بعد اُس کے شیشہ لیکر باہر نکلا غار کے دروازے پر اُس کا پانی چھڑک دیا اور دونو کے پیچھے پیچھے چلا۔ تھوڑی دُور جاکر وہ تو غائب ہو گئے میں اُلٹا پھر کر غار کی طرف آیا دیکھا کہ دروازہ غار کا ایک عظیم الشان پتھر سے مسدود ہے۔ سمجھا کہ تاثیر اُس پانی چھڑکنے کی یہی تھی بہت تعجب ہوا اور کہا کہ اے ناصر تو وہی ہے کہ ہر ایک بات کی تجویز سوچتا تھا اور تدبیر نکالتا تھا کیا حاصل کہ آخر موت کا کچھ علاج نہ کرسکا۔ سبحان اللہ ایسے ہی لوگوں کے حق میں کسی صاحب کمال کا کلام ہے ؎

رحم اللہ معشر الماضی	کہ بمردی جہاں سپردندے
آں بزرگاں چو زندہ مے نشوند	کاش ایں ناکساں بمردندے

دوا ناصر نے سفر خراسان میں شیخ المشائخ ابو الشمس جرجانی سے ملاقات کی اثنائے گفتگو میں اُس نے کہا کہ اے پابند عقل ناقص تیری میری صحبت موافق نہیں آسکتی۔ حکیم نے کہا کہ عقل ناقص کیونکر ہوسکتی ہے کہ۔ اَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ۔ قول مسلّم ہے۔ شیخ نے کہا کہ وہ عقل انبیا کی ہے نہ تیری اور ابو علی سینا کی کہ دونو اُس پر مغرور ہو۔ غرض سنہ ۸۳۱ھ ہجری میں فوت ہوا۔ کنز الحقائق نثر اور روشنائی نامہ نظم میں اس کی تصنیف ہے۔ دیوان قصاید حکمت و مضامین الٰہی سے مالا مال ہیں۔ چنانچہ ابو سہیل صعلوکی جو نیشاپور میں فاضل بزرگ و قاضی القضاۃ تھا اُس نے اسے فہمایش کی تھی کہ تو فاضل ہے اور کلام تیرا نہایت بلند ہوتا ہے۔ علماے ظاہری شہر خراسان کے تیرے مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں یہاں رہنا تیرا مناسب نہیں فی الحقیقۃ اُس کا مرتبۂ عالی یہاں کے عالموں کی حدِ فہم سے بلند ہے۔ راقم نے سفر بدخشان میں اُسکی قبر کو خود جاکر دیکھا ایسی دلچسپ و دلفزا جگہ ہے کہ وہاں سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ فیض آباد دار الخلافۂ بدخشان سے دو منزل کنارۂ جنوب مشرق کو ہے۔ ذات القیامۃ اور اشعار اور قصاید کا مجموعہ تین کتابیں اُس کی وہاں پائی جاتی ہیں۔ اُس کے بھائی

کی اولاد وہاں موجود ہے اور وہ علاقۂ یمگان کہلاتا ہے بمعنی ہزار کان کیونکہ وہاں اقسام جواہرات و معدنیات کی کانیں بہت ہیں۔ وہ قطعہ نہایت ٹھنڈا ہے فقط دو مہینے زمین برف سے خالی نظر آتی ہے نہیں تو ہمیشہ کوہ و دشت سفید رہتے ہیں یقین ہے کہ یہ رباعی اُنہوں نے وہیں کہی ہوگی۔ رباعی :-

دو شبنہ شبے کہ برف تا دو شم بود ‖ زانو چو عروسِ نو در آغوشم بود
پوشیدنیٔ نبود غیر از چشم ‖ چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

شہر بلغار جو تاتار کی حد شمالی میں ایک شہر ہے اور فی الحال روس کے علاقہ میں ہے، شاہ ناصر کا وہاں گزر ہوا اور اُس سفر میں نہایت تکلیف اُٹھائی۔ چنانچہ اس قطعہ سے کہ شاعرانہ ہے مگر اشارہ اس کا پایا جاتا ہے ؎ :-

ہمہ جورِ من از بلغاریانست ‖ کہ با دائم ہمیں باید کشیدن
گنہ بلغاریاں را نیز ہم نیست ‖ بگویم گر تو بتوانی شنیدن
خدایا ایں بلا و فتنہ از تست ‖ ولیکن کس نمے آرد تچیدن
ہمیں آرند ترکاں را ز بلغار ‖ ز بہر پردۂ مردم دریدن
لب و دندانِ آں خوبانِ چوں ماہ ‖ بدیں خوبی نبایست آفریدن
کہ از عشقِ لب و دندانِ ایشاں ‖ بدنداں ہم نمے باید گزیدن

اہل بدخشاں بلکہ دور و دراز ملکوں کے لوگ ان سے بہت اعتقاد رکھتے ہیں اور خود بادشاہ بدخشاں اُن کے مزار پر حاضر ہو کر نقد و جنس گھوڑے وغیرہ نذر چڑھاتا ہے کلام اس حکیم کامل کا جس قدر دیکھا محض خیالات حکمت و اصلاح نفس ہیں عشق کی بُو نہیں قطعہ

دیر بماندم دریں سرائے کہن ‖ تا کہنم کرد صحبتِ دی و بہمن
توشۂ تو علم و طاعت است دریں راہ ‖ سفرۂ دل را بدیں دو توشہ بیاگن

مثنوی

جوانی شد او را فراموش کن ‖ سر ناتوانی در آغوش کن

	ز نادیدنی چشمہا کور دار	ز بیہودہ ہا دیدہ مدہوش کن
	ز حیرت بخواں انچہ یزدانی است	نبشتِ شیاطیں فراموش کن
	ز حکمت خورش جوے مرجانت را	ولت معدہ سازد دہن نوش کن
	اگر نوش تو زہر کرد ایں فلک	بدانش تو زہرِ فلک نوش کن
ے	از چہ شد ہیچو ریسمانِ کہن	آں سر سبز و تازہ ہیچو سراب
	ماندی اکنوں خجل چو آں مفلس	کہ بشب گنج بیند اندر خواب
	ہمہ آں کن کہ گر بپرسند ت	زاں توانی درست گفت جواب
ے	ابا گشتہ غرّہ بکار زمانہ	ز مکرش مبدل گشتی آگاہ یا نہ
	دریں رہگزر چند خواہی نشستن	چرا بر نخیزی چہ ماندت بہانہ
	دو بدی بسے از پسِ آزروہا	بروزِ جوانی چو گاوِ زمانہ
	خدا از تو طاعت بدانش پذیرد	مبر پیشِ او طاعتِ جاہلانہ
	بس است اینکہ گفتمت افزوں نخواہد	چو تازی بود اسپ یک تازیانہ
	سخنہاے حجّت بعقل است سختہ (سنجیدہ)	مگرداں ترازوے او را ز بانہ
ے	بنی آدم گروہے بس لطیف اند	حقیقت ہم کثیف و ہم شریف اند
	در ایشاں ہست مشتے ناکس و خام	کہ عاقل دیو مردم سازدش نام
	بصورت زندہ لیکن جاں ندارند	وگر دارند جاں جاناں ندارند
	ز بیداری دل بیدار شاں نہ	بجز انکار خاصاں کار شاں نہ
	بداں خود را کہ گر خود را بدانی	ز خود ہم نیک ہم بد را بدانی
	چو خود دانی ہمہ دانستہ باشی	چو دانستی ز ہر بد رستہ باشی
	ترا نہ چرخ و ہفت اختر غلام است	تو شاگردی منی حیف تمام است
	بہ پرہیز اے برادر از لئیماں	بنا کن خانہ در کوے حکیماں

اشعار ناصر خسرو جو کہ آتشکدہ سے انتخاب ہوئے :-

بر ظاہر آرائی زال دنیا

جهان خود دگرگونه شد روزگارش / بران مهربان گشت صورت‌نگارش
بدیبا بپوشند نوروز رویش / بلؤلؤ بشست ابر گرد و غبارش
بدینسان همیں قرطهٔ سبز پوشند / درختے که اباں برون کرد ازارش
گر از رنگ خواہی به بستاں نظر کن / که پر نقش چیں شد میان و کنارش
بصحرا نگستر ز بنیاں بساطے / که یاقوت پود است و پیروزه تارش
نگه کن به ایں کاروان ہوائی / که پیروزه تاب است یکسره و بیه بارش
سوئے بوستانش فرستاده لیکن / بدست صبا داده گردون مهارش
که دیداست هرگز چنیں کاروانے / که جز قطره باراں ندارد قطارش
بسال نو آبادوں شد آں سال خورده / که بر خواست از ہر سوئے خواستگارش
چو جوزا که آراست ایں پیره زن را / ہماں کس که آراست پیرار و پارش
کناره کنند ز و خردمند مردم / نگیرد بجز جاہل اندر کنارش

خطاب بآسمان

چوں آسیا بت بنیم اے چرخ آسیائی / خود سوده مے نگردی مارا ہمے بسائی
بسیار گشته دورت تا کے نفس درازی / حدے و غائتے راست حدی و منتہائی
ہرگز قدیم باشد جنبنده مکانی / زیں قول مے تو جنبند شهری بروستائی

خود بینی

روزے ز سر سنگ عقابے بهوا خاست / از بہر طلب بال و پر خویش بیاراست
از راستی بال منی کرد و چنیں گفت / امروز ہمه روئے زمیں زیر پر ماست
چوں من که تواند بپرد از ہمه عالم / چه کرگس و چه ققنس و سیمرغ که عنقاست
بر اوج چو پرواز کنم از نظر تیز / بینم سر موئے ہمه گر در تک دریاست
گر بر سر خاشاک یکے پشه بجنبد / آں پر زدن پشه عیاں در نظر ماست

بسیار منی کرد و ز تقدیر نترسید
بنگر که ازین چرخ جفا پیشه چه برخاست
ناگه ز قضا سخت کمانے ز کمین گاہ
تیرے ز قضا و قدر انداخت بدو راست
بر بال عقاب آمد آن تیر جگر دوز
کز عالم علویش بسفلیس فرو کاست
بر خاک بیفتاد و بغلطید چو ماہی
وانگہ نظر خویش کشود از چپ و از راست
اینش عجب آمد کہ ز چوبی و ز آہن
این تندی و تیزی و پریدن ز کجا خاست
چون نیک نظر کرد پر خویش دران دید
گفتا ز کہ نالیم کہ از ماست کہ بر ماست
ناصر تو منی را ز سر خویش بدر کن
بنگر کہ عقابے کہ منی کرد چہ ہا خاست

سرانجام نعمت ہائے دنیا

ناصر خسرو براہے مے گذشت
مست و لا یعقل نہ چون میخوارگان
دید قبرستان و مبرز رو برو
بانگ برزد گفت کاے نظارگان
نعمت دنیا و نعمت خوارہ بین
اینش نعمت اینش نعمت خوارگان

لطیفہ

بار خدایا اگر ز روے خداے
طینت انسان ہمہ جمیل سرشتی
طلعت رومی و چہرۂ حبشی را
آلت خوبی تو بود و علت زشتی
چہرہ ہندو و روے ترک چرا شد
ہمچو دل دوزخی و روے بہشتی
از چہ سعید اوفتاد و از چہ شقی شد
زاہد محرابی و کشیش کنشتی
چیست خلاف اندر آفرینش عالم
چون ہمہ را دایہ و مشاطہ تو گشتی

عبرۃ

چند گردی گرد این بیچارگان
ناکسان را جوئی از بس ناکسی
تا توانستی ربودی چون عقاب
چون شدی عاجز گرفتی کرگسی
فاسقی بودی بوقت دست رس
پارسا گشتی کنون از مفلسی

حکیم مجدود الدین عارف سنائی

یہ بزرگ صاحب دل خاندانِ عالیشان شرفاے غزنیں سے تھا۔ باپ اُس کا اوہم اور پیر اُس کا یوسف ہمدانی اور خود شاگرد ابو علی فارندی کا تھا سلطان بہرامشاہ بادشاہِ وقت چاہتا تھا کہ اپنی بہن کی شادی اس شریف روزگار کے ساتھ کرے مگر اس نے قبول نہ کیا۔ عذر میں جو قطعہ لکھا دو شعر اُس میں سے یہ ہیں ؎ :-

من نہ مردِ زن و زر و جاہ ام	بخدا اگر کنم و گر خواہم
گر تو تاجے دہی ز احسانم	بسرِ نو کر تاج نستانم

علوم میں مہارت کلی رکھتا تھا۔ اس واسطے بلقب حکیم معروف ہے دولتِ دنیا کے ساتھ دولتِ خدا شناسی بھی پائی تھی اس واسطے عارف سنائی مشہور ہے۔ اُس زمانہ تک سوا ے علما و حکما کے کس و ناکس شاعری میں دست اندازی نہیں کرتے تھے اور اکثر مطالبِ مفیدہ کے سوا اس فن کو ہزلیات میں خرچ نہ کرتے تھے۔ یہ صاحبِ کمال شعر میں یگانۂ عصر تھا اور دولت و جاہ سے فارغ البالی میں بسر کرتا تھا۔ سلسلۂ فقر میں اس طرح داخل ہوا کہ سلطان نے ایک دفعہ موسم سرما میں ہند کی طرف فوج کشی کی وہی دن کوچ کا تھا اور سنائی قصیدہ اُس کی مدح میں کہہ کے دربار کو لے چلا۔ چاہتا تھا کہ جلد پہنچے تا دربار برخاست نہ ہو جائے۔ شراب خانہ کے آگے سے نکلا گانے کی آواز کان میں آئی کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ ایک دیوانہ شراب پی رہا ہے اور نشہ کے سرور میں ساقی سے کہتا ہے کہ لا ایک جام سلطان ابراہیم کی اندھی آنکھوں کی یاد میں۔ ساقی نے کہا اے دیوانہ ایسے بادشاہ عالیجاہ کے حق میں ایسی بدزبانی کا کلمہ کہتا ہے۔ دیوانہ نے کہا کہ جھوٹ کیا ہے ایک بے انصاف لالچ خوردہ ہے جو ملک قبضہ میں ہے اُسے سنبھال نہیں سکتا۔ اور کی ہوس ہے۔ جاڑہ میں سفر کرتا ہے

خلق خدا کی تکلیف کا خیال نہیں جب یہ فتح کریگا اور کے پیچھے پڑجائیگا۔ وہ جام لیکر پی گیا اور کہا کہ ساقی لا جام حکیم سنائی کی اندھی آنکھوں کی یاد میں۔ پھر ساقی نے کہا کہ اے کمبخت ایسے شاعر لطیف و خوش کلام کو اس طرح کہتا ہے۔ مستان نے کہا شاعر کیا ہے ایک احمق ہے جھوٹے سچے واہیات جوڑ کر ایک احمق کے آگے کھڑا ہوتا ہے اور پڑھتا ہے۔ جب خدا سوال کریگا تو کیا جواب دیگا۔ یہ سنتے ہی سنائی کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ ایک حالت طاری ہوئی۔ اُسی وقت سارا دیوان جس میں قصاید بادشاہوں کی تعریف کے تھے ڈبو دیا اور ننگے سر ننگے پاؤں پھرنے لگا۔ لوگوں نے جانا دیوانہ ہوگیا۔ دوست اقربا سب رونے پیٹنے لگے مگر وہ یہی کہتا تھا کہ میرے حال پر تاسف نہ کرو کہ یہ تو عین خوشی کا مقام ہے۔ چند روز جوش و خروش زیادہ رہا آخر وعظ اور پند اور نصیحت و حکمت پر کلام نے قرار پکڑا اور ایسا خداشناس ہوا کہ آج تک بڑے بڑے مولوی موحد اُس کے معتقد ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ امام غزالی اس کا مرید ہے۔ اس کو مولوی روم سے درجہ دوم میں خیال کرتے ہیں مگر خود مولوی روم کا کلام اُس کی شان میں اس طرح ہے ؎

دیگ جوشی کردہ ام من نیم خام	از حکیم غزنوی بشنو تمام

ایک دن اس کی پا برہنگی اور شکستہ حالی دیکھ کر تمام دوست آشناؤں کو رنج ہوا اور صلاح مشورہ کرکے اس کے سمجھانے کو آئے جب بہت منت و زاری کی تو اس نے بھی وعدہ کیا کہ کل جوتی پہنونگا۔ جب دوسرے دن آئے تو کہا کہ کل والا سنائی آج نہیں ہے اب معاف فرمایئے اور تشریف لیجایئے جوتی مجھے رستہ نہیں چلنے دیتی۔ اُس کے دیوان میں تیس ہزار شعر ہیں مضامین نصایح و خداشناسی سے مالا مال ہے۔ حدایق الحقایق کتاب منظوم اس کی عجیب و غریب کتاب ہے۔ ابوالفضل اُس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اور فی الحقیقت مضامین حکمت کے اور مطالب آزادانہ ہیں۔ سال تصنیف اُس کا

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے ؎

پانصد و سی و چار فیہ زعام ۔۔۔ پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

اُس کے دس باب اور علاوہ اس سے بھی ۶ مثنویاں اُسکی اور ہیں (۱) سیر العباد (۲) تاریخ التحقیق (۳) کارنامہ (۴) عشق نامہ (۵) عقل نامہ (۶) بموجب قول خوشگو کتاب کنز الرموز بھی اس کی تصنیف ہے باوجودیکہ اُس کی تصنیفات کی حفاظت کے لئے اوّل ہی تدبیریں کی گئیں یہاں تک کہ جمالی ارو سنائی خود غزنیں گیا اور اُس کی کل تصنیفات کو لیکر مرتب کیا مگر اس پر بھی سب نسخوں میں کمی بیشی از اختلاف ہے۔ عہد اکبر میں عزیز خاں کوکہ کے پاس کہ جس کو خان اعظم بھی کہتے ہیں ایک نسخہ کلیات سنائی کا پہنچا جو نہایت معتبر تھا اور ۶۱۱ھ میں تحریر ہوا تھا اُس سے عبد اللطیف بن عبد اللہ عباسی نے لیکر ۱۰۶۷ھ میں تصحیح کی لکھنؤ میں دیکھا گیا اور اُس سے زیادہ تصنیفات اس شاعر کی نہیں پائی گئیں۔ حدیقہ کی شرح نور اللہ احراری غزنوی نے کہی ہے ؏
اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی نے اُس کے جواب میں حدیقہ لکھا تھا لیکن نہ پہنچ سکے اہل تصوف اسکے کلام کو سنداً لاتے ہیں۔ قصاید بھی بہت ہیں اور اسی رنگ میں ہیں ؎

مکن در جسم و جان منزل کہ این دون است و آن والا ۔۔۔ قدم زین ہر دو بیرون نہ نہ اینجا باش نہ آنجا

سلیمان ساوجی نے اس پر بہت خوب قصیدہ لکھا ہے لیکن اس کا کلام شاعرانہ اور اُس کا کلام عارفانہ ہے۔ کئی دفعہ مکہ معظمہ و خراسان کا سفر کیا مرو میں گیا اور ابو یوسف ہمدانی کا مرید ہوا۔ ریاضت و عبادت الٰہی میں بقیہ عمر بسر کی آخر ۶۲ برس کے سن میں ۵۷۶ھ یا ۵۲۵ھ میں غزنیں میں مرگیا۔ اُس کے سال وفات میں اختلاف ہے۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ خانقاہ اُس کی اب تک آباد ہے اور اہل غزنیں اُس سے اعتقاد رکھتے ہیں۔ وقت نزع کے دیکھا کہ حکیم کچھ آہستہ آہستہ کہتا ہے کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ یہ شعر زیر لب تھا ؎

بازگشتم زانچہ گفتم زانکہ نیست ۔۔۔ در سخن معنی و در معنی سخن

ایک بزرگ نے سن کر کہا کہ عجب مشکل مقام ہے کہ سخن کو ترک کیا اور پھر بھی اسی میں مشغولیت باقی رہی۔ صاحب ہفت اقلیم کہتا ہے کہ تصانیف اس کی ایک دیوان مشتمل بر قصاید و غزل و رباعی ہے اور حدیقہ اور کنز الرموز اور کارنامہ۔ سر دیوان اُن کا یہی قصیدہ ہے

طلب اے عاشقانِ خوش رفتار — طرب اے نیکوانِ شیریں کار
تا کے از خانہ ہین رہ صحرا — تا کے از کعبہ ہین رہ خمار
زین سپس دست ما و دامن دوست — بعد ازیں گوش ما و حلقہ یار
ترکتازی کنیم و برشکنیم — نفسِ زنگی مزاج را بازار
تا ز خود بشنوو نہ از من و تو — لمن الملک واحد القہار
کلبہ کاندرو نہ خواہی ماند — سال عمرت چہ دہ چہ صد چہ ہزار
تا ترا بار دولت است نہ — از جہانِ خدا اے برخوردار
چوں ترا پاک از تو بستاند — دولت آں دولت ہست کار آں کار
دہ چہ بود آں دلے کہ اندر وے — گاو خر باشد و ضیاع و عقار
علم کز تو ترا نہ بستاند — جہل ازاں علم بہ بود صد بار
راہ توحید را بعقل مجو — دیدہ روح را بخار مخار
بخدا از کسے تواند بود — بے خدا از خدا اے برخوردار

تمثیل

داشت لقماں یکے وثاقے تنگ — راست چوں حلقِ نائے و سینہ چنگ
بلفضولے سوال کرد از وے — چیست ایں خانہ شش بدست و سہ پے
با لب خشک و چشم گریاں پیر — گفت ھٰذا لمن یموت کثیر

[illegible]

تمثیل دیگر

ایں متاعِ جہاں چو مرداریست — کرگساں گرد وے ہزار ہزار
ایں یکے را ہمیں زند مخلب — واں دگر را ہمیں زند منقار

آخر الامر پر بریدہ ہمہ
واز ہمہ بازماندہ ایں مردار

ایک صاحب کمال اُس کے مرثیہ میں کہتا ہے۔

مُرد سنائیؔ نہ ہمانا کہ مرد
مُردنِ آں خواجہ نہ کاریست خورد

جانِ گرامی بہ پدر باز داد
کالبد تیرہ بہ مادر سپرد

کاہ نہ بُد او کہ بباد ے برفت
آب نہ بُد او کہ بسرما فسرد

گنج زرے بود دریں خاکداں
کو دو جہاں را بجوے مے شمرد

قالبِ خاکی سوے خاکی فگند
جانِ خرد سوے سماوات بُرد

جانِ دوم را کہ ندانند خلق
مغلطہ گویم کہ بجاناں سپرد

صاف درآمیخت بدردی مے
بر سرِ خم رفت و جُدا شد ز دُرد

قصیدہ

مکن در جسم و جاں منزل کہ آں دونست ایں والا
قدم زیں ہر دو بیروں نہ نہ اینجا باش نہ اونجا

بہر چہ از راہ باز افتی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں
بہر چہ از دوست وامانی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

گواہ رہرواں باشد کہ سردش یابی از دوزخ
نشانِ عاشق آں باشد کہ خشکش بینی از دریا

سخن کز روے دیں باشد چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہرِ حق باشد چہ جابلسا چہ جابلقا

عجب نبود کہ از قرآں نصیبت نیست جز حرفے
کہ از خورشید جز گرمی نیابد چشم نابینا

بہ تیغِ عشق شو کشتہ کہ تا عمرِ ابد یابی
تو خود دانی کہ مے نوشی ازیں گویائی ناگویا

ور از دوزخ ہمے ترسی بمال کس مشو غرّہ
کہ اینجا صورتش مالست آنجا شکلش اژدرہا

گر امروز آتشِ شہوت بکشتی بیگماں رستی
وگرنہ تف کہ آں آتش ترا ہیزم کند فردا

ازیں مشتِ ریاست جوے رعنا ہیچ نکشاید
مسلمانی ز سلماں جوے و دردِ دیں ز بودردا

گرت نزہت ہمے باید بصحراے قیامت شو
کہ اونجا باغ در باغ است خواں در خواں و وا در وا

مگو مغرور و غافل را براے امن او نکتہ
مدہ مخمور و جاہل را ز بہرِ طبع او خرما

چو علمت ہست خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

چو تن جانرا مزیّن کن بعلم دیں که زشت آید ... ازیں سو شاه عریاںؔ وزآں سو کوشکِ دیبا
ترا یزداں همے گوید که در دنیا مخور باده ... ترا ترسا همے گوید که در صفرا مخور حلوا
تو بهرِ دیں نه بگذاری حرام از حرمتِ یزداں ... ولیک از بهرِ تن مانی حلال از گفتهٔ ترسا
مرا بارے بحمد الله زراهِ حکمت و همت ... بسوئے خطِّ وحدت بُرد عقل از خطّهٔ اشیا
نخواهم لاجرم نعمت نه در دنیا نه در جنّت ... همے گویم بهر ساعت چه در سرّا چه در ضرّا
که یارب مر سنائی را سنائے ده تو در حکمت ... چناں کز وے برشک آید روانِ بوعلی سینا
مگرداں عمرِ من چوں گل که در طفلی شوم کشته ... مگرداں حرصِ من چوں مُل که در پیری شوم بُرنا
بحرص ار شربتے خوردم مگیر از من که بد کردم ... بیاباں بود و تابستان و آبِ سرد و استسقا

بهرچه از اولیا گفتند ارزُقنی و وفّقنی
بهرچه از انبیا گفتند آمنّا و صدّقنا

درگهِ خلق همه زرق و فریبست و هوس ... کار در کارِ خداوند جهاں بیکن و بس
هر که او نام کسے یافت ازاں درگه یافت ... اے برادر کسِ او باش و میندیش ز کس
بندهٔ خاص ملک باش که از داغ ملک ... روزها ایمنی از شحنه و شبها ز عسس
گرچه با طاعتی از حضرتِ او لا تامن ... گرچه با معصیتی از در او لا تیئاس

گرچه خوبی بسوے زشت بخواری منگر
کاندریں ملک چو طاوس بکارست مگس

بس که شنیدی صفتِ روم و چیں ... خیز و بیا ملکِ سنائی ببیں
تا همه دل بینی بے حرص و بخل ... تا همه جاں یابی بے کبر و کیں
پاے نه و چرخ بزیرِ قدم ... دست نه و ملک بزیرِ نگیں
زر نه و کاں ملکے زیرِ دست ... خر نه و اسپ فلکے زیرِ زیں
گاه ولی گوید هست او چناں ... گاه عدو گوید هست او چنیں
او ز همه فارغ و آزاده خوش ... چوں گل و چوں سوسن و چوں یاسمیں

خشم نبود است بر اعداش ہیچ
چشم ندید است بر ابروش چیں

برگ بے برگی نداری لاف درویشی مزن
رخ چو عیاراں میارا جاں چو نامرداں مکن

یا برو ہمچوں زناں رنگے و بوئے پیش گیر
یا چو مرداں اندر آو گوے در میداں فگن

ہر چہ یابی جز ہوا آں دیں بود در جاں نگار
ہر چہ بینی جز خدا آں بت بود در ہم شکن

چوں دو عالم زیر پایت قطع شد پائے مکوب
چوں دو کون اندر دو دستت جمع شد دستے بزن

سر برآر از گلشن تحقیق تا در کوے دیں
کشتگانِ زندہ بینی انجمن در انجمن

در یکے صف کشتگاں بینی بتیغے چوں حسینؓ
در دگر صف خستگاں بینی بزہرے چوں حسنؓ

درد دیں خود بوالعجب دردیست کاندر وے چو شمع
چوں شوی بیمار بہتر گردی از گردن زدن

ہر کسے از رنگ گفتارے بایں رہ کے رسد
درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع
عاقلے کامل شود یا فاضلے صاحب سخن

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ماہہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش
صوفئے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

ہفتہا باید کہ تا یک پنبہ از آب و گل
شاہدے را حلّہ گردد یا شہیدے را کفن

روزہا باید کشیدن انتظارِ بے شمار
تا کہ در جوفِ صدف باراں شود دُرِّ عدن

صدق و اخلاص درستے باید و عمرِ دراز
تا قرینِ حق شود صاحبقرانے در قرن

باد و قبلہ در رہِ توحید نتواں رفت راست
یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

عذر مناکحۃ بحضرت شاہی

اے زفرّ تو دین و ملک چناں
کہ جہاں را زفرّ فرور دیں

مکن احسان خود بمن ضائع
کہ زبانم تہی است در تحسیں

من نگویم کہ ایں بد است ولیک
من نیم در خورِ چنیں تمکیں

پیش چوں من گرسنہ نہ نہند
قرص خورشید و خوشۂ پرویں

کرد اکرام خود خلیل ولیک / نخورد جبرئیل عجل سمین
تا توای مفخر عصر در شهری / بنده را غول همدست و قرین
گاه برسان مارم از بر کوه / گاه مانند مور زیر زمین
ای ز من خوش مرا مکن ناخوش / که مکافات آن نباشد این
زین و مرکب ترا مرا بگذار / تا شوم زین پیادگی فرزین
شهپر جبرئیل مرکب اوست / چه کند جبرئیل مرکب و زین
مسکن خود گذاشتم به شما / می چه خواهید از من مسکین
من بچشم شما کسی شده ام / ورنه کس نیستم بچشم یقین
گرچه صد کار داشتم در مرو / از برای تو رفتم از غزنین
حق بدست من و من از جهال / از ملامت چو صاحب صفین
من ندانم کیم کزین درگاه / خلق در شادیند و من غمگین
آری آری ز ضعف باشد اگر / گرد دو شیره کم تنند عنین
من چه دانم جمال حضرت تو / خر چه داند جمال حور العین
روح عیسی ترا چه جوئی ریح / دم آدم ترا چه جوئی طین
گرچه از خوی بنده گرم شوند / خواجگان عجول کبر آگین
همه صفرای خواجگان ببرد / ذوق این قطعهٔ ترش شیرین

به قید زندان

مسلمانان مسلمانی مسلمانی / ازین آیین بی دینان پشیمانی
شگفت آید مرا بر دل ازین زندان سلطانی / که در زندان سلطانان منم سلطان زندانی

ے

دلا تا کی درین عالم فریب این و آن بینی / یکی زین چاه ظلمانی برون شو تا جهان بینی
جهانی کاندرو هر دل که یابی پادشا یابی / جهانی کاندرو هر جان که بینی شادمان بینی

نہ بر اوج ہوائی او عقابِ لشکری یابی
نہ اندر قعرِ بحر او نہنگِ جاں ستاں بینی

ورو گر جامہ پوشی ز فضلش آستیں یابی
ورو گر خانہ سازی ز عدلش آشیاں بینی

ز حرص و شہوت و کینہ بتر باز آں سپس خود را
اگر دیوے ملک یابی وگر گرگے شباں بینی

نظرگاہِ الٰہی را یکے بستاں کن از عشقے
کہ در وے بو و رنگ و گل ز خونِ دوستاں بینی

ز دولتیاری آں نبود کہ از گل بوستاں سازی
کہ دولتیاری آں باشد کہ در دل بوستاں بینی

تو یکساعت چو افریدوں بمیداں باش تا زاں پس
بہر جانب کہ رو آری درفشِ کاویاں بینی

چو جاں از دیں قوی کردی تن از خدمت ہزیں کن
کہ اسپِ غازی آں بہتر کہ با برگستواں بینی

اگرچہ طیلساں داری مشو غرہ کہ در دوزخ
یکے طوق است از آتش کہ آنرا طیلساں بینی

بدیں زور و زرِ دنیا مشو غرہ چو بے عقلاں
کہ ایں آں نو بہاری نیست کش بے مہرگاں بینی

اگر عرشی بفرش آئی وگر ماہی بچاہ افتی
وگر بحری تہی گردی وگر باغی خزاں بینی

یکے از چشم و دل بنگر بآں زندانِ خاموشاں
کہ نا یاقوت گویا را بتابوت از چہاں بینی

سرِ زلفِ عروساں را چو شاخِ نسترن یابی
رخِ گلرنگ شاہاں را برنگِ زعفراں بینی

چہ باید نازش و نالش باقبال و بادباری
کہ تا برہم زنی دیدہ نہ ایں بینی نہ آں بینی

سرِ الب ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں
درون آ تا کنوں در گل تنِ الب ارسلاں بینی

کوئی کہ بعد ما چہ کنند و کجا روند
فرزندگان و دخترگانِ یتیم ما

خود یاد ناوری کہ چہ کردند و چوں شدند
آں مادران و آں پدرانِ قدیم ما

ہ با ہمہ خلق جہاں گرچہ از آں
بیشتر کم رہ و کمتر برہند

آں چناں زی کہ بمیری برہی
نہ چناں زی کہ بمیری برہند

ہ کسے کش خرد رہنمونست ہرگز
بگیتی رہ رسم الفت نہ ورزد

کہ صحبت نفاقیست یا اتفاقی
دل مردِ دانا ازیں ہر دو لرزد

کہ گر خود نفاقیست جاں را بکاہد
وگر اتفاقی بہجراں نیرزد

آدمی را دو بلا کردہ رہی یا کند پرشکم خویش زنان غلام	واند از ہر دو بلا روز بہی یا کند پشتِ خود از آب تہی

اوحدالدین انوری

وطن اُس کا ولایت ابی ورد پیدایش کی جگہ موضع بدنہ ہے جو کہ ضلع مہنہ علاقۂ خراسان سے ہے۔ اس علاقہ کو صحرائے خاوران کہتے ہیں اسی واسطے پہلے خاوری تخلص کیا تھا۔ عمارہ اس کے استاد نے ایک دن خوش ہو کر انوری تخلص عنایت کیا۔ مدرسۂ منصوریہ شہر طوس میں تعلیم پائی تھی۔ عالم شباب میں تحصیل علم پر توجہ کی۔ چند روز میں کمال حاصل کیا۔ انوار شاعری اور اوصاف علمی اُسکے اظہر من الشمس ہیں مسند علم و فضل کو چھوڑ کر شاعری اس طرح اختیار کی کہ باوجود تکمیل علم کے اوّل فلاکت و مفلسی سے نان شبینہ کو محتاج تھا۔ ایک دن اپنے مدرسہ کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ دیکھا کہ ایک امیر بڑے جاہ و حشم سے جاتا ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے کسی نے کہا شاعر بادشاہی ہے۔ انوری نے کہا سبحان اللہ علم کا یہ مرتبۂ عالی اور میری یہ بدحالی شاعری فضیلت کا ادنےٰ مرتبہ اور اُس کو یہ فارغ البالی۔ اُسی رات سلطان سنجر کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ ؎ :-

اگر دل و دست بحر و کاں باشد	دل و دستِ خدائگاں باشد
شاہ سنجر کہ کمتریں خدمش	درجہاں بادشہ نشاں باشد
آنکہ با داغ طاعتش زاید	ہرچہ زا بنائے انس و جاں باشد
آنکہ با مہر خازنش روید	ہرچہ زا جناس بحر و کاں باشد
عدلش ار بازبیں بہ قہر شود	امن بیرون آسماں باشد

نبود حظّ روزیِ مجرا — گر نہ دستِ تو اش زباں باشد
نشود کارِ عالمے بنظام — گر نہ پائے تو در میاں باشد
در جہانی و از جہاں بیشی — ہمچو معنے کہ در بیاں باشد
چوں بجنبد رکابِ منصورت — ہی قیامت کہ آں زماں باشد

روحِ روح الامیں دراں ساعت
نہ ہمانا کہ در اماں باشد

کسی تدبیر سے دربار تک پہنچ کر سنایا۔ بادشاہ نہایت سخن شناس تھا۔ اُسی وقت ملک الشعرا کیا۔ رفتہ رفتہ اس مرتبہ کو پہنچا کہ دو دفعہ خود بادشاہ اُس کے گھر آیا۔ اکثر علوم میں اُس کی تصنیفات ہیں منجملہ اُن کے ایک رسالہ مسمی مفید علم نجوم میں ہے اس علم میں اُسے مہارت تھی لیکن اُس کی نحوست سے بڑی تباہی اُٹھائی۔ اُسے اپنے کمال کا بڑا دعوےٰ تھا چنانچہ ایک قطعہ میں خود کہا ہے کہ زمین خراسان میں کل تین آدمی صاحب کمال ہوئے ہیں تیسرا اُن میں سے میں ہوں اوّل اسعد مہنہ عالم جو امام غزالی کا معاصر تھا اور اُن سے ہمیشہ مباحثہ کرتا رہتا تھا (۲) خواجہ ابوعلی احمد ساوان خاورانی وزیر طغرل (۳) خود انوری + آخر عمر میں گوشہ نشین ہوا۔ ۵۸۶ھ یا ۵۹۲ھ میں شہر بلخ میں مرگیا۔ قبر سلطان میرزا احمد خضرویہ کے برابر میں اس کی قبر ہے۔ کلام اس صاحب کمال کا اعلےٰ مرتبۂ فصاحت و بلاغت پر ہے۔ سلاطین اور بزرگان وقت کی تعریف میں بہت قصیدے کہے ہیں اور ایسی طرز خوش آیندہ نکالی ہے کہ جس کی پیروی قصیدہ گوئی میں اب تک اہل ایران واجب جانتے ہیں۔ غزلیں عاشقانہ بھی بہت ہیں مگر وہ اُس مرتبہ پر نہیں شمار ہوئیں باوجود اس علم و کمال کے ہجو ایسی فاحش اور بے حیا کہتا ہے کہ جس کی حد نہیں۔ ماں باپ تو بالائے طاق خدا تک کو نہیں چھوڑتا ؎

ہر بلائے کہ ز آسماں راند — گو کہ بر دیگرے قضا باشد

برزمیں نارسیدہ مے گوید	خانۂ انوری کجا باشد

ایضاً

اگر خدا ے بداند کہ انوری ست حیات	ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل

اخیر عمر میں گوشہ نشین ہوا اس لئے مضامین نصیحتانہ و آزادانہ بھی دلچسپ کہتا ہے اُسی عالم میں ایک دفعہ بادشاہ نے بلا بھیجا نیشاپور سے یہ قطعہ لکھا ؎

کلبۂ کاندرو نہ روز و نہ شب	جاے آرام و خورد و خواب من است
حالتے دارم اندرو کہ دراں	چرخ در عین رشک و تاب من است
ہرچہ در مجلسِ ملوک بود	ہمہ در کلبۂ خراب من است
رحل اجزاو نان خشک برو	گرد خوان من و کباب من است
شیشۂ صبر من کہ بادا پُر	پیش من شیشۂ شراب من است
قلم کوتہ و صریرِ خوشش	زخمہ و نغمۂ رباب من است
خرقۂ صوفیانۂ ازرق	برتر از اطلس انتخاب من است
ہرچہ بیروں ازیں بود کم و بیش	حاش للسامعین عذاب من است
گندہ پیر جہان حسب نکند	ہمتے راکہ در جناب من است
ایں طریق از نمایش است خطا	چہ کنم ایں خطا صواب من است
خدمت بادشہ کہ باقی باد	نہ بہ بازوے خاک و آب من است
گرچہ پیغام روح پرورِ او	ہمہ تسکین اضطراب من است

نیست من بندہ را زبان جواب
جامۂ و جائے من جواب من است

دفتر ۳ ابوالفضل نے اُس کے دیوان کا انتخاب کیا اور خاتمہ میں ایک صفحہ عبارت لکھی اُس میں انوری کو ابوالمدائح اور ہجا بندہ خطاب دیا ہے۔ اس کے دیوان کو نگارخانہ معنی کہتا ہے۔ یہ بھی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے نزدیک حکیم سنائی اور خاقانی سنجیدگیِ خیالات

التواریخ

اور اسلوب حالات میں افضل ہیں۔ اکثر کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ سلطان طغرل کے عہد میں ماہ رجب ۵۸۱ہجری میں برج میزان میں ساتوں سیارہ ایک درجہ میں جمع ہوئے۔ انگریزی تاریخوں سے بھی سند اس کی پائی جاتی ہے۔ یعنی ۱۱۸۶ء میں جمع شمس سنبلہ میں ۳۰ درجہ پر تھا ۶ سیارہ جمع ہوئے۔ بموجب اس حساب کے ٹھیک ۳ جمادی الثانی یا پہلی رجب ۵۸۰ہجری ہوتے ہیں۔ علم نجوم نے جس کی بنیاد فقط قیاس پر ہے یعنی علم دین اور عقل کے آئین دونو سے برخلاف ہے۔ ایک دفعہ لوگوں کو بہت گمراہ کیا۔ اور غوطہ سب نے یہ کہا یا کہ جب طوفان نوح آیا تھا تو یہ قران سرطان یعنی برج آبی میں ہوا تھا۔ اب کی دفعہ میزان برج ہوائی ہے۔ چاہئے کہ ہوا سے عالم فنا ہو تمام لوگ زندگی سے ناامید ہو گئے۔ لیکن انجام کو قدرت الٰہی سے یہ حکم بالکل جھوٹ بلکہ بالعکس ہوا۔ تمام نجومی شرمندہ ہوئے۔ انوری قہر شاہی میں گرفتار ہوا۔ تجویز ہوئی کہ عورتوں کا لباس پہنا کر تشہیر کریں۔ اور قدرت خدا کہ جس شب کے لئے طوفان کا حکم لگایا تھا۔ اس شب کو ایک شخص کسی مینار پر چراغ جلائے بیٹھا تھا۔ اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ اس کے چراغ کو ذرا حرکت ہو۔ بلکہ اس سال ایسی ہوا کی قلت رہی کہ زمیندار لوگ اپنے خرمن بھی نہ صاف کر سکے۔ غرض کہ قاضی حمیدالدین ولوالجی کی سفارش سے مخلصی پائی مگر مارے ندامت کے شہر چھوڑ کر بھاگا۔ شاعروں نے اسکی ہجویں کہیں چنانچہ

فرید کاتب

گفت است انوری سبب بادہائے سخت — ویران شود عمارت و کہسار سربسری
در روز حکم او نہ وزید است ہیچ باد — یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

تاریخ نگارستان اور مرات جہاں نما میں بعد اس ذکر کے لکھا ہے کہ اس سنہ میں چنگیز خاں نے ترکستان میں ظہور کیا کہ یہ بھی طوفان سے کم نہ تھا۔ اہل انصاف پر روشن ہے کہ یہ عذر اس گناہ سے بھی زیادہ سخت ہے ؎

از کرامات شیخ ما چہ عجب — گر بشاشید گفت باران ہست

اوّل تو دو نو صورتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور اگر بالفرض یہی مراد لی جائے تو خراسان اور عراق میں یعنے جہاں انوری نے حکم لگایا تھا تیس[۳۰] برس بعد تسلّط چنگیز خاں کا ہوا۔ ع بہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا ۔ امیر خسرو کا ایک شعر اس جگہ بہت مناسب ہے ۔ قول سہ کس نیست بدہر استوار ۔ شاعر و قرعہ زن و اختر شمار ۔ بعد اس تجربہ کے انوری نے بھی بہت اشعار نجوم کی ہجو میں لکھے کہ اسکے دیوان میں موجود ہیں۔

قطعہ

تکلّف میانِ دو آزادہ مرد	بود ناپسندیدۂ سخت خام
بیا تا تکلّف بیکسو نہیم	نہ از تو قعود و نہ از ما قیام
بہ سنت کنیم اقتدا زیں سپس	سلامٌ علیک و علیک السّلام

حکمۃ

کارہائے طلب مکن غایت	تا نمانی ز کار خود محروم
زیرکاں ایں مثل نکو زدہ اند	طلب الغایۃ اے برادر شوم

تجربہ

چہار چیز است شد آئین مردم ہنری	کہ مردم ہنری نیست زیں چہار بری
یکے سخاوتِ طبعی چو دستگاہ بود	بہ نیکنامی آنرا بہ بخشی و بخوری
دو دیگر آنکہ دلِ دوستاں نگہ داری	کہ دوست آئینہ باشد چو اندرو نگری
سہ دیگر آنکہ زبانرا بگاہ گفتنِ بد	نگاہ داری تا وقت عذر غم نخوری
چہارم آنکہ کسے کو بجائے تو بد کرد	چو عذر خواہد نام گناہ وے نبری

ہزار بار ترا انوری نصیحت کرد
وے چہ سود کہ خود غافلی و بے خبری

ابوالفضل نے اس کے تمام کلام میں سے ایک قطعہ انتخاب کیا ہے ۔

من و ایں شیوہ کہ با قحبۂ رعنائے جہاں	چوں خساں عشق نہ بازم نہ بسہو و نہ بعمد

قوّتِ دادن اگر نیست مرا باکے نیست　　　قُوّتِ ناستدن ہست و لِلّٰہِ الحمد

اُس کے دیوان کے ابیات والفاظ مُشکلہ کی شرح ابوالحسن نے لکھی ہے اور وہ اکثر پائی جاتی ہے مگر خاطرخواہ کارروائی اُس سے نہیں ہوتی ۔

اشعار انوری

همدمے گفت صبر کن زیرا کہ　　　صبر کارے تو خوب و زُود کند
آب رفتہ بجوے باز آرد　　　کار ہنر از آنچہ بود کند
گفتم آب از بجوے باز آید　　　ماہیِ مُردہ را چہ سُود کند

ص آنکس کہ چکر خورد و بمرد بے ہنر آموخت　　　در دورِ قمر گو بنشیں خون جگر خورد
پیغام زناں میبرد و دیبای بزر پوش　　　یا مسخرگی میکن و حلوای شکر خور

ص تو وزیری و منت مدحت گوے　　　دست من بے عطا روا نبیٔ
تو وزارت بمن سپار و مرا　　　مدحتے گوے تا عطا بینی

خانۂ را نقش مے کردند نقاشانِ چیں　　　بشنو این معنی کزیں بہتر حدیثے نشنوی
اوستادے نیمۂ را کرد ہمچو آئینہ　　　نیمۂ را اوستاد ثانی کرد نقشِ مانوی
تا ہر آں نقشے کہ حاصل باشد اندر نیمۂ　　　بینی اندر نیمۂ دیگر چو اندر وے روی
اے برادر خویشتن را خانہ داں ہمچناں　　　ہم بسقف نیک عالی ہم بہ بنیاد قوی
تا اگر آں نیمۂ پُر نقش نتوانی شدن　　　جہد مے کن تا مگر آں نیمۂ دیگر شوی

در حدودِ رے سیکے دیوانۂ　　　سال مہ کردے بکوہ و دشت گشت
در تموز و دی بسالے یک دو ماہ　　　جانبِ شہر آمدے از طرف دشت
گفتے اے آنانکہ تاں آمادہ بود　　　گاہِ قرب و بعد ازیں زرّینہ طشت
قاقم و سنجاب سرما پنج شش　　　توزی و کتّاں بگرما ہفت ہشت
گر شما را با نوائی بود چہ شد　　　ور چہ مارا بود بے برگی چہ گشت
راحت ہستی و رنجِ نیستی　　　بر شما نگذشت و از ما ہم گذشت

آں شنیدستی کہ روزے زیرکے با ابلہے
گفت این والیِ شہرِ ما گدائے بیحیاست

گفت چوں باشد گدا آں کز کلاہش تکمۂ
صد چو مارا و شمارا سالہا برگ و نواست

گفت اے مسکیں غلط اینک ازینجا کردۂ
آں ہمہ برگ و نوا دانی کہ آنجا از کجاست

دُرّ و مروارید طوقش اشکِ اطفالِ من است
لعل و یاقوت ستامش خونِ ایتامِ شماست

او کہ تا آب سبو پیوستہ از ما خواستہ است
گر بجوئی تا بمغزِ استخوانِ زنان ماست

خواستن کدیہ ہست خواہی عشر داں خواہی خراج
زانکہ گر دہ نام باشد یک حقیقت را رواست

چوں گدائی چیزِ دیگر نیست جُز خواہندگی
ہر کہ خواہد گر سلیمان است و گر قاروں گداست

اے خواجہ درازیت رسیدہ است بجائے
کز اہلِ سماوات بگوشت نہ رسد صوت

گر عمرِ تو چوں قدِ تو بودے بدرازی
تو زندہ بماندے و بمردے ملک الموت

صدر الحکما ظہیر الدین طاہر ابن محمد فاریابی

اصل وطن اس حکیم فاضل شاعر کامل کا ایک موضع غیر مشہور جنگجو اور مہیمنہ متصل ہفت
فاریاب علاقۂ ترکستان ہے۔ لوگ وہاں کے صحرانشین گلہ ہائے اسپ و گوسفند سے گزران کرتے ہیں چونکہ علم منطق و حکمت و ہیئت وغیرہ میں مہارت کلی رکھتا تھا اس لئے صدر الحکما لقب حاصل کیا۔ فاضل کامل تھا اور طبیعت خداداد موزوں تھی۔ شاعری میں بھی کمال پیدا کیا۔ شاعری میں شاگرد رشیدی سمرقندی کا ہے۔ اول حکام مازندران کی مدح کرتا تھا۔ جب شہرت ہوئی تو پہلے محمد الدکر بادشاہ کی خدمت میں آیا بعد ازاں قزل ارسلاں کا منظور نظر ہوا۔ وہاں سے بھاگ کر اتابک ابوبکر کی خدمت میں آیا۔ لیکن چونکہ مجیر بیلقانی شاعر اتابک مذکور کی توجہ سے کامیاب عیش و عشرت تھا ظہیر

ہفت اقلیم ... شاہ

یہاں بھی رشک سے مکدر رہتا تھا چنانچہ ایک جگہ اُس پر طعن کرتا ہے ؎

اگر بدیباہائے فاخر آدمی گردد کسے | پس وز اطلس چیست گرگ در عبا چہ پوسمار

ایک شب محفلِ اتابک میں ایک رباعی کہہ کر پڑھی ہزار اشرفی انعام ملی۔ رباعی:-

اے وردِ ملائکہ دُعائے سرِ تو | سر نیست زمانہ را بجائے سرِ تو
با دشمنِ تو نیامِ شمشیر گفت | سرِّ دلِ من باد فدائے سرِ تو

شیخ سعدی بوستان میں اپنے بادشاہ کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

چہ حاجت کہ نُہ کرسیٔ آسماں | نہم زیرِ پائے قزل ارسلاں

یہ طعن ہے ظہیر کے شعر پر کہ وہ اپنے قصیدے میں کہتا ہے ؎

نُہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیرِ پا | تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں زند

اُس کی داڑھی سُرخ رہتی تھی ایک دن قزل ارسلان نے اُس سے براہ خوش طبعی کہا کہ اپنی لال داڑھی کے باب میں کوئی شعر اسی وقت کہہ کر سنا اور کچھ انعام طلب کر۔ اُس نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہا۔

واعظے بر فرازِ منبر گفت | کہ چو پیدا شود سرائے نہفت
ریشہائے سیاہ روزِ اُمید | باشد اندر پناہِ ریشِ سفید
باز ریشِ سفید را ز گناہ | بخشد ایزد بریشہائے سیاہ
مردکے سُرخ ریش حاضر بود | دست در ریش شد چو او بشنود
گفت ما خود دریں شمار نئیم | در دو گیتی بہیچ کار نئیم
بندہ آں سُرخ ریشِ مظلوم است | کہ ز انعامِ شاہ محروم است

بعد قزل ارسلان کے اصفہان میں بطریق سیاحی گیا۔ ایک دن عبداللطیف خجندی قاضی القضا کی محفل میں بھی جا نکلا۔ علما و فضلا سے مجلس بھری تھی۔ غریبوں کی طرح گوشہ میں بیٹھ گیا۔ قاضی نے سلام کا جواب تک بھی نہ دیا اُس نے اُسی وقت ایک قطعہ لکھ کر قاضی کے ہاتھ میں دیا اور چلا آیا۔ قطعہ:-

بزرگوارا دنیا ندارد آں عظمت — کہ ہیچکس را زیبد بداں سرافرازی
شرف بفضل و ہنر باشد و ترا ہمہ ہست — بدیں نعیم مزوّر چرا ہمے نازی
زچیست کاہلِ ہنر رانمے کنی تمیز — تو نیز چوں بہ ہنر در زمانہ ممتازی
بمن نگاہ بیازی مکن ازانکہ بفضل — دلم بگیسوئے حوراں ہمے کند بازی
اگرچہ نیست خوشت یک سخن زمن بشنو — چنانکہ آنرا دستور حال خود سازی
تو ایں سپر کہ زدنیا کشیدہ بر رُو — بروز عرض مظالم چناں براندازی
کہ از جواب سلامی کہ خلق را بر تست — بہیچ مظلمۂ دیگرے نپردازی

اُسے پڑھ کر قاضی بہت شرمندہ ہوا معلوم ہوا کہ ظہیر یہی ہے۔ ہرچند منّت اور معذرت کی لیکن پھر ظہیر اصفہان میں نہ ٹھیرا۔

ہفت اقلیم و دولت شاہی — امامی ہروی یا مجد الدین ہمگر سے درباب انوری اور ظہیر کے بذریعہ ایک قطعہ کے شعرائے وقت نے استفسار کیا۔ اُس نے بھی ایک قطعہ میں جواب دیا لیکن انوری کو ترجیح دیتا ہے بہرحال اشعار اُس کے اعلےٰ مرتبہ فصاحت و بلاغت میں ہیں دیوان اس کا ہمیشہ کمیاب اور عزیز الوجود ہے کسی شخص کا شعر ہے ؎

دیوانِ ظہیر فاریابی — در کعبہ بدزد و اگر بیابی

دولت شاہی و مرات الخیال — آخر عمر میں شہر تبریز میں گوشہ نشین ہو کر ۵۹۸ھ میں فوت ہوا۔ گورستان سرخاب میں پہلوے خاقانی میں دفن ہے۔ دیوان اُس کا اُس کے بعد مجد الدین ہمگر شاعر کے زمانہ میں مرتّب ہوا مصنّف دیباچہ میں کہتا ہے کہ میری قسمت ایسی کہاں تھی کہ ایسے صاحب فضل و کمال کی صحبت پاتا یہی غنیمت ہے کہ اُس کی تصنیفاتِ پارہ پارہ کو جمع کر کے سعادت کا ذخیرہ جمع کروں۔ قصّۂ مہر و وفا بھی اُس کی تصنیف ہے۔ غزل

زاندوہِ غمت درسینہ ام راہِ فغاں گم شد — زبیدادِ تو ام حرفِ شکایت از میاں گم شد
چناں برہم زدی ہنگامۂ شورِ قیامت را — کہ اکثر نامۂ اعمالِ مردم از میاں گم شد

چناں در جستجویت شد بحشر شورشے پیدا — که علمای شفاعت از کفِ پیغمبراں گم شد
نے دانم کدامی خنجرِ مژگاں ہلاکم کرد — دو صد صف بریکدگر خوردند و قاتل از میاں گم شد
چه بیهوده گشته مجنوں تو برخیز و سراغش کن — که امشب ناقهٔ لیلیٰ میانِ کارواں گم شد

اگر پرسید احوالِ ظهیری را بگوئیدش
بدام افتاده آں مرغے که شب از آشیاں گم شد

اشعارِ غزل

بخلقم نشست فلاطوں ز شرم آب شد — بحیرتم که فلاطوں شد و شراب شد
ز تیره بختیِ آئینه سخت حیرانم — ترا کشید در آغوش و آفتاب شد

اشعارِ قصیده

هفت اقلیم

مرا ز دست ہنرہاے خویشتن فریاد — که ہر یکے بدگر گونه داردم ناشاد
بزرگ تر ز ہنر در عراق عیبے نیست — زمن بپرس که این نام بر تو چوں افتاد
ہنر نهفته چو عنقا بدار زانکه نماند — کسیکه باز شناسد ہماے را از خاد
نشنیے که من از فضل در جہاں بدم — ہماں جفاے پدر بود و سیلیِ اُستاد
کمینه پایهٔ من شاعری است خوش بنگر — که چند گونه کشیدم ز جور او بیداد
به پیش ہر که ازاں یاد میکنم حرفے — نمے کند پس ازاں تا نوازدم بر یاد
بناے عمر خرابی گرفت چند کنم — برنگ و بوے کساں خانه ہوس بنیاد
مرا ازاں چه که شیریں لبیست در کشمیر — مرا ازاں چه که سیمیں بریست در نوشاد
برین پسند کن و حال مرح ہیچ مگوے — که شرح دردِ دلِ آں نمے توانم داد
ببیں گلے که مرا بشگفد بدل اینست — که بنده خوانم خود را و سرور آزاد
ہزار دامن گوہر نثار شاں کردم — که ہیچکس شبہے در کنار من ننهاد
گہے لقب نهم آشفته رنگئی را حور — گہے خطاب کنم مست سفله را آزاد
ہزار بیت بگفتم که آب از و بچکید — که جز دو دیده دگر آبم از کسے نگشاد

تنم گداخت چو شمع از عنا درین فکرت — که آتش از چه نهادند در دلِ فولاد
دلم چو پا به جگر خورد تا بدانستم — که آدمی ز چه پیدا شد و پری ز چه زاد
ولیک هیچ ازین در عراق ثابت نیست — تو خواه در همدان گیر و خواه در بغداد
مرا خود از هنر خویش هیچ روزی نیست — خوشا فسانهٔ شیرین و قصهٔ فرهاد
ز شعر جنس غزل بهتر است و آنهم نیست — بضاعتے که توان ساختن ازان بنیاد

درین زمانه چو فریادرسے نمی‌بینم
مرا رسد که رسانم بر آسمان فریاد

غزل

چشم آهو گر به بیند شصت زه گیر ترا — بیدهد چون مغز جا در استخوان تیر ترا
پیکرت آزرده گردد از لطافت گر کشد — بر حریر برگِ گل نقاش تصویر ترا
از شهیدانِ نگاهت هیچ افغان نخاست — داده اند از سرمه گویا آب شمشیر ترا
بشود در جان سنبل ریشه اش در پیچ و تاب — گر به بیند حلقهٔ زلفِ گره گیر ترا
محرم بزم اجابت نیستی خاموش باش — آزمودم بارها اے نالهٔ شبگیر ترا

گر ز روے صدق از عصیان پشیمانی ظهیر
شادمان بنشین که بخشیدند تقصیر ترا

غزل

خراج چین خم زلفت ز مشک ناب گرفت — رخ تو آینه از دست آفتاب گرفت
گر آفتاب نهٔ از چه صبحدم امروز — تو چون سوار شدی ماهِ نو رکاب گرفت
تو تا ز شرم فگندی بچهره زلف سیاه — فغان ز خلق برآمد که آفتاب گرفت
بگو بخواب که امشب میا بدیدهٔ من — جزیرهٔ که مکانِ تو بود آب گرفت

پس وفات بمن ناله دست داد ظهیر
فغان که دشمنِ جانی مرا بخواب گرفت

رباعی

از ابر گریه بین و نگوکین ترشح است — از کوه ناله بین و مپندار کان صداست
کبک دری که قهقههٔ شوق میزند — آسیب قهر پنجهٔ شاهینش از قفاست

۵ آسمان همچنان بجاے خود است — بر همان قطب و بر همان محور
از کجا خواست این رواے جهل — از چه افتاد این کسادِ هنر
آنکه خود را نظیر من دانست — گرچه او سنگ بود و من گوهر
این زمان در تنعم است که چرخ — مے نیارد برو گماشت نظر
در کفش ناله مے کند بربط — بر رخش خنده مے کند ساغر

من چو بربط زبون زخمهٔ چرخ
من چو ساغر غریق خونِ جگر

هر کرا در دل از خرد اثر است — صفتِ ذات او همه هنر است
هنری باش و هر چه خواهی کن — نه بزرگی بمادر و پدر است
اندرین فرجهٔ زمین و سپهر — دل نه بندی که منزلِ مقر است
پدر است آں ولیک بے نفع است — مادر است آں ولیک باضر است
هر که هستند از وضیع و شریف — جمله را حوض مرگ آبخور است
مردمِ بے خبر زروے قیاس — برِ آنکس که صاحب بصر است

گرچه از جنس مرد هست امّا
در حقیقت ز جنسِ گاؤ خر است

زین سینهٔ پر آتش و زین دیدهٔ پر آب — دردا که گشت قاعدهٔ عمرِ من خراب
گردون نهد ز سفرهٔ حسرت مرا طعام — گیتی دهد ز ساغرِ محنت مرا شراب
گفتم که در شباب کنم دولتے بدست — دولت بدست نامد و از دست شد شباب
آنچه آمده است بر تنم از چرخ نامد است — از دودهٔ معاویه بر آلِ بوتراب

فغاں ز فرقتِ احباب و یاد عہد شباب	دیار عمر و امیدم خراب دادہ بآب
دریغ عمر گرامی و مدّتِ شادی	دریغ عہد جوانی و صحبتِ احباب
دریغ چو لالۂ سیر لب من چو دید کہ بست	زمانہ بردو بناگوش من ز برف نقاب
اگر بسوگ عزیزاں کنند جامہ سیاہ	سیاہ کردم من موے خود بسوگ شباب

مکن گناہ بامّید آنکہ گوئی ہست
خداے عزّ و جل ہر گناہ را توّاب

افضل الدّین خاقانی

نام اس صاحب کمال کا افضل الدین باپ علی نجّار یعنی بڑھئی تھا۔ اقربا سے مادری جولاہہ کا کام کرتے تھے اور وطن شہر شروان تھا۔ باوجود اس کے علم اور کمال ایسی چیز ہے کہ اس کو خدا نے بادشاہ مُلکِ فصاحت کا کیا۔ بدیل اور حسان العجم اس کے باپ نے خطاب دیا ؎

چوں دید کہ در ہنر تمام ام	حسّانِ عجم نہاد نامم

ولہ

بدیل آدم اندر جہاں سنائی را	ازاں سبب پدرم نام من بدیل نہاد

خاقانی اور فلکی شروانی ہم مشق اور شاگرد ابو العلائی گنجوی ملک الشعرا کے تھے۔ استاد نے خاقانی کو ہونہار اور لائق دیکھ کر اپنی بیٹی کے ساتھ شادی کی فلکی خفا ہوا اور ارادہ سفر کا کیا۔ استاد نے بیس ہزار روپے اُسے دیئے اور کہا اے فرزند خفا نہ ہو یہ روپیہ لے اور ۲۰ لونڈیاں جو حسن و جمال میں ابو العلا کی بیٹی سے فائق ہوں اپنے لئے خرید لے۔ فلکی زر مذکور لے کر اس ارادہ سے باز رہا لیکن خاقانی سے

ہمیشہ مباحثہ اور تکرار رہتا تھا۔ افسوس ہے کہ جب خاقانی مرتبۂ عالی کو پہنچا تو اُستاد سے منحرف ہوگیا۔ اُستاد نے بھی اُسے تہمت ہائے ناشایستہ لگائی تھیں اور فحش آمیز ہجویں کہتا تھا اُن میں سے ایک قطعہ لکھا جاتا ہے۔ قطعہ :-

عمرے بچشم خویشتن از بہر مردمی — جا کردمش کہ باشد از اغیار ناپدید
از آب دیدہ نخل قدش پرورش گرفت — چنداں کہ ہمچو شاخِ گل از ناز سر کشید
چوں طفلِ اشک عاقبت آں شوخ بے وفا — از چشم من برآمد و بر روے من دوید

چنانچہ وہ آپس کے شکوے و شکایت اور ہجویں کتابوں میں مندرج ہیں۔ غرض خاقانی نے ملک منوچہر بادشاہ شروان کی سرکار میں ایسا مرتبۂ عالی حاصل کیا کہ خاص عام اس کے انعام سے فیضیاب ہوتے تھے اور اُس زمانہ کے شاعر اُسکی تعریف میں قصاید نظم کرتے تھے۔ اوّل تخلّص اس کا حقیقی تھا مگر بادشاہ کو خاقان قرار دیکر خود خاقانی تخلّص کیا۔ ایک دفعہ خاقانی شروان سے عراق کو بطریق سفارت بھیجا گیا۔ چنانچہ احمد ساوی نے اُس کی تعریف اور اس مہم کے حسن سر انجام میں قصیدہ لکھا ہے۔ کلیات اس کا ایک مجلّد ضخیم ہے۔ قصائد مدح اُس میں بہت ہیں اور بہت خوب ہیں بلکہ اس طرز خاص میں صاحب ایجاد ہے۔ بادشاہ ہر قصیدہ پر ہزار روپیہ اور خلعت بیش بہا عطا کرتا تھا۔ غزلیں عاشقانہ بھی بہت خوب کہتا ہے۔ اور کلام اکثر نصیحت اور پند و حکمت میں ہوتا ہے۔ مگر بعضی دفعہ ہجو بھی بہت بے باک کہتا تھا۔ سفر کعبہ میں ایک مثنوی ۳ ہزار شعر کی نہایت فصیح و بلیغ پُر مضمون اور نصیحت آمیز لکھی ہے تحفۃ العراقین اُس کا نام ہے۔ لیکن اُس سے حال راہ یا کیفیت سفر کچھ معلوم نہیں ہوتی کہیں آفتاب سے گفتگو کرتا ہے کچھ اُس کی خوبیاں کچھ بے آرامیاں کہتا ہے کہیں آسمان سے کہیں زمین سے باتیں کرتا ہے کبھی جن جن لوگوں سے راہ میں ملاقات ہوئی اُن کی تعریف کرتا ہے۔ خصوصاً جمال الدین موصلی وزیر جس کے ساتھ حج کو گیا ہے اُس کا بہت شکریہ کرتا ہے۔ اس کے آخر میں بھی اپنے خسر اور استاد ابو العلائی گنجوی کی بہت ہجو کرتا

(دولت هفت) ہے اور نصیحت اور حکمت کے مضمون بھی اسی ذیل میں اکثر کہتا ہے۔ آخر عمر میں دنیا سے دل برداشتہ ہوکر استعفا چاہا۔ بادشاہ نے منظور نہ کیا اس واسطے خفیہ بھاگا۔ لیکن بیلقان سے گرفتار ہوکر آیا۔ سات مہینے تک قلعہ مسمی شابران میں قید رہا۔ دلتنگ ہوکر زمانہ کی شکایت میں ایک قصیدہ لکھا اور آخر بادشاہ بھی اس سے دست بردار ہوا۔ اس قصیدہ میں بالکل اصطلاحیں مذہب ترسا و مجوس وغیرہ مذاہب قدیمہ کی ہیں اسی سبب سے بہت مشکل ہے۔ حکیم ارزقی شاعر نے جواہر الاسرار میں اسکی شرح لکھی ہے۔ جبکہ سفر حج میں جمال الدین موصلی کے ساتھ تھا اس کی تعریف و شکریہ میں بھی ایک قصیدہ چار مطلع کا بہت طویل لکھا ہے۔ (هفت ا) اس قید سے بسفارش والدۂ بادشاہ خلاص ہوا اور ترک دنیا و گوشۂ عزلت اختیار کرکے تبریز میں بیٹھا۔ اسی شہر میں بیچ سنہ ۵۸۲ یا ۵۹۵ھ ہجری کے فوت ہوا قبر اس کی بمقام سرخاب ہے ظہیر الدین محمد فاریابی اس کے پہلو میں ہے۔ مولوی جامی نفحات الانس میں اس کو حکماے اہل دل میں داخل کرتے ہیں اور شاگرد فلکی کا لکھتے ہیں۔ مگر کتب مذکورہ بالا سے شاگرد ہونا ثابت نہیں۔ ابو الفضل نے اس کے دیوان کا بھی انتخاب کیا ہے چنانچہ ایک نثر خاتمہ میں لکھتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اس کا مضامین حکمت سے کلمات قدسی ہے اور خود خاقانی کو حکیم خاقانی خطاب دیتا ہے ◦

تمہید قصیدہ

قحط وفاست در بنہ آخر الزماں	ہاں اے حکیم پردۂ عزلت بساز ہاں
فلسی شمر ممالک این سبز بارگاه	صفری شمر (خزائن) فذالک این تیرہ خاکداں
جیحون آفت است برآن آب گینہ پل	کہ سایۂ بلاست برآن غول دیدہ باں
اوّل بیار شیرہ بہاے عروس فقر	وانگہ ببر قبالۂ اقبال رائگاں
اسکندر و تنعم ملک دو روز عمر	خضر و شعار مفلسی و عمر جاوداں
ہم جنس در عدم طلب اینجا مجوے از انک	نیلوفر از سراب نداد است کس نشاں

	خود باش ابنِ خود مطلب کس کہ پیل را	ہم گوش بہتر از پرِ طاوس پشہ را
	در دم سپید مہرۂ وحدت بگوش دل	خیز از سیاہ خانۂ وحشت بپای جاں
	تو غافل و سپہر کشندہ رقیب تو	فرزانہ خفتہ و سگ و دیوانہ پاسباں
	وہر سپید دست سیہ کاسہ ہست صعب	منگر بہ خوش زبانیِ ایں ترش میزباں
	کاں خوشتریں نوالہ کہ از دستِ او خوری	لوزینہ ایست خوردۂ الماس درمیاں
	دل دستگاہ تست بدست جہاں مدہ	کیں گنج خانہ را ندہد کس بہ ایرماں
	ہر لحظہ ہاتفے بہ تو آواز میدہد	کیں دامگہ نہ جائے امانست الاماں
	آواز ایں خطیبِ الٰہی تو نشنوی	کز جوشِ غفلت ہست ترا گوش دل گراں
	از ایں و آں دو مطلب چوں ہیچ ہست	زیرا اجل گیاست عفا فیر ایں و آں
	خود را درم خرید رضائے خدائے کن	دامن از ایں خدائے فروشاں فرو فشاں

پند

	مشو خاقانیا مغرور دولت	کہ دولت سایۂ ناپائدار است
	بدولت ہر کہ شد مغرہ چناں داں	کہ میدانش آتش وا زنے سوار است

حکمت

	زبانِ تو در سود دانستن ہست	توان تو در ناتوانستن ہست
	ندانم سر سازِ خاقانیا	کہ دانی کہ اکسیر دانستن ہست
۵	قلمِ بختِ من شکستہ تر است	موے در سر بطالع ہنر است
	نقشِ امید چوں تواند بست	قلمے کز دلم شکستہ تر است
	بمقامِ رسیدہ ام کہ مرا	خار و حنظل بجائے گل شکر است
	غم ہم از عالم است و در عالم	مے نگنجد کہ بس قوی حشر است

جاہل آسودہ فاضل اندر رنج
فضل مجہول جہل معتبر است

فخریّہ

خاقانی آں کساں کہ براہ تو میروند ‌‌‌‌ ‌ زاغند و زاغ را روش کبک آرزوست

بس طفل کارزو ے ترازو ے زر کند ‌ ‌ نارنج ازاں خرد کہ ترازو کند ز پوست

گیرم کہ مار چوبہ کند تن بشکل مار ‌ ‌ کو زہر بہر دشمن و کو مہرہ بہر دوست

غزل

لب تو قیمت شکر بشکست ‌ ‌ رخ تو رونق قمر بشکست

من خود از غم شکستہ دل بودم ‌ ‌ عشقت آمد تمام تر بشکست

نیش مژگاں چناں زدی بر دل ‌ ‌ کہ سر نیش در جگر بشکست

غزل

دریں عہد از وفا بوئے نماند است ‌ ‌ بعالم آشنا روئے نماند است

جہاں دست جفا بکشاد آوخ ‌ ‌ وفا را زور بازوئے نماند است

چہ آتش سوخت بستان وفا را ‌ ‌ کہ از خشک و تر ش بوئے نماند است

فلک جائے بو آویخت جانم ‌ ‌ کز آنجا تا اجل موئے نماند است

ہمیں عالم کہ اندر نسل آدم ‌ ‌ بدیدم آدمی خوئے نماند است

نظر بردار خاقانی ز خوباں
جگر میخور کہ دل جوئے نماند است

اُس کے قصاید وغیرہ کے حل مشکلات میں ایک شرح محمد ابن داؤد بن محمد ابن محمود شاہد آبادی نے اور ایک خان آرزو ے اکبر آبادی نے لکھی ہے ؎

اشعار خاقانی

از نسخۂ

درخت وفا راکنوں برگ ریز است ‌ ‌ ازیں برگ ریز وفا میگریزم

گر از سایۂ غیر سر میر ہانم ‌ ‌ گر از خود چو سایہ جدا میگریزم

بمن آشکارا دہ آں مے کہ داری ‌ ‌ بہ پنہاں مدہ کز ریا میگریزم

من از باده گویم تو از توبه گوئی
مگو کز چنین ماجرا میگریزم

حریفِ صبوحم نه تسبیح خوانم
که از سبحهٔ پارسا میگریزم

هم از دوست آزرده‌ام هم ز دشمن
پس از هر دو تن در خدا میگریزم

به بزغاله گفتند بگریز گفتا
که قصاب در پے کجا میگریزم

دل از تعلیم غم رنجد معاذالله که بگذارم
که غم پیر دبستان است و دل طفل شبستانی

چه آزاد اند درویشان ز آسیب گرانباری
چه محتاج اند سلطانان باسبابِ جهانبانی

بدا سلطانیا کو را بود رنجِ دل آشوبی
خوشا درویشیا کو را بود رنجِ تن آسانی

پس از صد سال روشن گشت بر خاقانی این معنی
که سلطانیست درویشی و درویشی است سلطانی

سخن گفتن ز حق کیست میدانی و میپرسی
فلک را بین که میگوید ز خاقانی ز خاقانی

اگر بر احمد مختار خوانند این چنین شعرے
ز صدر او صدا آید که قد احسنت حسّانی

ز قطرانِ شب و کافور روزم حاصل این آمد
که ز آنم دیده کافور است و زینم جامه قطرانی

امید وفا دارم و هیهات که امروز
در گوهر آدم بود این گوهر نایاب

جز ناله کسے همدم من نیست ز مردم
جز سایه کسے همره من نیست ز اصحاب

آزرده چه خشم نکنم آرزوے کس
آرے نرود گرگ گزیده زپئے آب

امروز منم روز فرو رفتهٔ شبخیز
سرگشتهٔ این بخت سبکپای گران خواب

گرم است دمم چون نفس کورهٔ آتش
تنگ است دلم چون دهنِ کوزه سیماب

با اینهمه امید نه بیهوده توان داشت
کان قطرهٔ تلخ است که شد لولوی خوش آب

از حادثه سوزم که برآورد ز من دود
وز تابشِ نالم که فرو برد ز من تاب

بیمارم و چون گل که نهی در تهِ کوزه
که در عرقم غرقه و گه در تبم از تاب

چون زال ز طفلی شده‌ام پیر ز احداث
زانست که رد کردهٔ اخوانم و احباب

خورسندیٔ من دل دہدم گرنہ بد خلق
سیمرغ غم زال خورد گر نخورد باب

مگزین درِ دوناں چو بود صدر قناعت
منگر مہ نخشت چو بود ماہ جہاں تاب

ایام بنقصان و ترا کوشش بیشی است
خورشید بسرطان و ترا پوشش سنجاب

ہاں اے دلِ خاقانی اگرچہ ستمِ دہر
بر نافتنی نیست مشو تافتہ بر تاب

تحقیق سخن گوے نخیزد ز سخن وزد
تعلیق رسن باز نیاید ز رسن تاب

گو آنکہ سخندان مہیں بود بحکمت
گو آنکہ ہنر بخش بہیں بود بآداب

گو آنکہ ولی نعمت من بود و عم من
عمے کہ خداوند و پدر بود بہر باب

آں خاتمۂ کار مرا خاتم دولت
آں فاتحۂ طبع مرا فاتح ابواب

ادریس قضا بینش و عیسیٔ رواں بخش
دادہ لقبش دُرِّ ہنر واضع القاب

دلہاے ما قرار دہِ درد کردہٗ
وار القرار بر دلِ ما سرد کردہٗ

ہاں اے سپاہ طیر ابابیل زینہار
کاصحاب فتنہ ہرچہ توانند کردہٗ

۵
اے قبلۂ جاں کجات جویم
جانی و بجاں ہوات جویم

دیروز چو آفتاب بودی
امروز چو کیمیات جویم

اے دُرِّ گراں بہا ترا ز روح
چوں عمر گراں بہات جویم

دریا کنم اشک پس بدریا
در ہر صدفے جدات جویم

دوشت ہمہ ہمچو بدر دیدم
و امشب ہمہ چوں شہاب جویم

اے بلبل چند گشتہ وقت است
کز نوحہ گری نوات جویم

خاقانی ست آشناے عشقت
ہم در دل آشنات جویم

از ساغر زمانہ کہ نوشید شربتے
کاں نوش جاں گزاے تر از سم نیامد است

گیتی ترا ز حادثہ ایمن کجا کند
کورا ز حادثات اماں ہم نیامد است

وز دیست نقب زنِ فلک اندر سرای عمر
آری بهرزه قامتِ او خم نیامد است

آسودگی مجوی که کس را بزیر چرخ
اسباب این مراد فراهم نیامد است

باخستگی بساز که ما را از روزگار
زخم آمد است حاصل و مرهم نیامد است

خاقانیا فریب جهان را مدار گوش
کو را ز دور قاعده محکم نیامد است

هان ای دل عبرت بین از دیده نظر کن هان
ایوان مداین را آئینهٔ عبرت دان

یکره ز رهِ دجله بمنزل بدائن کن
وز دیده دوم دجله برخاک مداین ران

دندانهٔ هر قصری پندی دهدت از نو
پند سر دندانه بشنو ز بن دندان

گوید که تو از خاکی ما خاک تو ایم اکنون
گامی دو سه بر ما نه اشکی دو سه هم بفشان

از نوحهٔ چغد الحق مائیم بدردِ سر
از دیده گلابی کن درد سر من بنشان

بر دیدهٔ من خندی کاین جا چه میگرید
گریند بران دیده کاینجا نشود گریان

کسری و ترنج زر پرویز و به زرین
برباد شده یکسر برخاک شده یکسان

از خونِ دلِ طفلان سرخاب رخ آمیزد
این زال سپید ابرو این مام سیه پستان

خونِ دل شیرین است این می که دهد از تن
ز آب و گل پرویز است این خم که نهد دهقان

گفتی که کجا رفتند آن تاجورانِ یک یک
زایشان شکم خاکست آبستن جاویدان

خاقانی ازین درگه دریوزهٔ عبرت کن
تا از درِ تو زین پس دریوزه کند خاقان

امروز گر از سلطان رندی طلبد توشه
فردا ز درِ رندی توشه طلبد سلطان

ای چرخ از آن ستاره رعنا چه خواستی
ای باد از آن شکوفهٔ زیبا چه خواستی

ای زال مستحاضه که آبستنی ز شیر
زان خوش عذار غنچه عذرا چه خواستی

ما را جگر دریغ نبود از تو هیچ وقت
آخر ز گوشهٔ جگرِ ما چه خواستی

گر بقدرِ سوزشِ دل چشمِ من بگریستے
بر دلِ من مرغ و ماہی تن بتن بگریستے

دیدہاے بختِ من بیدار بایستے کنوں
تا بدیدے حالِ من بر حالِ من بگریستے

انچہ از من شد گر از دستِ سلیماں گم شدے
بر سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

مقتداے حکمت و صدرِ زمن گر بعد او
گر زمیں را چشم بودے بر زمن بگریستے

کاشکے آدم برجعت در جہاں باز آمدے
تا بمرگِ ایں خلف بر مرد و زن بگریستے

خاقانی از حدیثِ زمانہ زباں ببست
کز ہرچہ ہست بہ ز زباں کوتہیش نیست

گیرم ز روے عقل ہمہ زیرکیش ہست
با کیدِ روزگار بجز ابلہیش نیست

ہدہد ز آب زیرِ زمیں آگہست لیک
از دام بر فرازِ زمیں آگہیش نیست

چوں زماں عہدِ سنائی در نوشت
آسماں چوں من سخن گستر بزاد

چوں بغزنیں ساحرے شد زیرِ خاک
خاکِ شرواں ساحرے دیگر بزاد

بلبلے زیں بیضۂ خاکی گزشت
طوطیِ نوریں کہن منظر بزاد

چوں بپایاں شد ریاحیں گل دمید
چوں سر آمد صبحِ صادق خور بزاد

ماہ چوں در جیبِ مغرب برد سر
آفتاب از دامنِ خاور بزاد

در فلاں تاریخ گویند از جہاں
چوں بروں بہمن شد اسکندر بزاد

یوسفِ صدیق چوں در بست نطق
از قفا موسیِ پیغمبر بزاد

تہنیت باید کہ در باغِ سخن
چوں شگوفہ فوت شد نوبر بزاد

گر شہابے برد چرخ اختر گزاشت
وز زہابی خورد خاک اخضر بزاد

ایں مثل خواندی کہ مُرغِ خانگی
دانہ برخورد و پس گوہر بزاد

از بہر بارہ پیرِ فلک را بدستِ صبح
دلق ہزار میخ ز سر برکشیدہ اند

ابینک پئے موافقتِ صفِّ صوفیاں — صوف سفید برتنِ مشرق دریده اند
در مشرق آفتاب چناں جامہ خرقہ کرد — کاو از خرقِ جامہ بمغرب شنیده اند
تا کُنج را براہ براهیم کعبہ است — مردان کعبہ کُنج نشیمن گزیده اند

من دیده ام که حدِّ مقامات او کجاست
آناں ندیده اند که کوتاه دیده اند

خدایگان سپہر آستاں نکو داند — که در جہان سخن بنده بے نظیر افتاد
بداں مبیں که زپشتِ دروگری زادست — بلے خلیل پیمبر ہم از دروگر زاد

بدَل من آدمم اندر جہان سنائی را
بدیں دلیل پدر نامِ من بدیل نہاد

نظامی گنجوی

حال دستگاه علوم و فنون کا کسی کتاب سے مفصّل معلوم نہیں ہوتا لیکن اصول و فروع شعر و سخن میں کمال ہے۔ اگرچہ خاص و عام میں وطن ان کا گنجہ مشہور ہے لیکن آپ کہتے ہیں

چو دُر گرچہ در بحرِ گنجہ گم ام — ولے از قہستان شہرِ قم ام

ت الانس
ت اقلیم
شاہ

سب اہلِ تذکرہ و تاریخ لکھتے ہیں کہ دُنیا کے جاہ و منصب کے لئے سلاطین وقت کا روزگار نہیں کیا۔ تمام عمر گوشۂ قناعت میں بیٹھکر کمال علم اور اصلاح نفس میں کوشش کرتے رہے اور خود اس بات کا نہایت فخر کرتے ہیں۔ لیکن قصیدے جو بادشاہوں کی تعریف میں کہے ہیں اُس سے برخلاف اس کے ثابت ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لطف صحبت حاصل کرنے کو حکام اور بادشاہ خود ان کے پاس آتے تھے۔ جب قزل ارسلان بادشاہ ایران ملاقات کو آیا۔ دیکھا کہ ایک غار کے دروازے پر بوریا بچھا ہے۔ ایک پیر مرد

بیٹھا ہے۔ قرآن اور قلم دوات اور عصا سامنے رکھا ہے سبحان اللہ ؎

اے ہما پیش فقیری سلطنت کیا مال ہے ۔۔۔ بادشاہ آتے ہیں پابوس گدا کے واسطے

خمسۂ نظامی جس کو بعضے پنج گنج بھی کہتے ہیں نہایت مشہور کتاب ہے۔ امیر خسرو اور جامی اور فیضی و ہاتفی وغیرہ بہت شاعروں نے اُسکے جواب میں خمسے لکھے لیکن ایک نہ پہنچا۔ کلام اس کا از روے فصاحت و بلاغت و رعایت فنّ شاعری عیب اور سقم سے پاک ہے لیکن سکندر نامہ میں بمقام ربابہ سکندر بعد قتل دارا ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بفرمود تا تیغ و طشت آورند ۔۔۔ دو بدبخت را پیش تخت آورند

کہ یہ قافیہ ناجائز ہے اور ایسے شاعر مسلّم الثبوت سے نہایت تعجب کا مقام ہے۔ خیالات اُس کے چونکہ تمام پند و نصائح سے مالا مال ہیں اس لئے اعلےٰ مرتبہ کی تعریف کے قابل ہیں۔ لیکن چونکہ اہل زمانہ میں خیالات عاشقانہ عام تھے اس لئے اُس کے مضامین کا اکثر جگہ رنگ بدل گیا یعنی عاشقانہ ہو گئے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ ایک فلسفی کامل اور تصنیفات اُس کی خالص حکمت و معرفت کی اصل اصول ہوتی۔ یہ پانچوں کتابیں جدا جدا قصّہ ہیں کہ مختلف بادشاہوں کی فرمایش سے تصنیف کی ہیں۔ شوقین لوگوں نے پانچوں کو ایک جگہ جمع کر کے پنج گنج اور خمسہ نام رکھا ہے۔ مخزن[1] اسرار سنہ ۵۸۲ھ میں بہرام شاہ رومی کے نام سے لکھی ہے۔ اُس کے صلہ میں ہزار روپیہ سکۂ عراق اور ایک قطار خچروں کی اور بہت سے خلعت و لباس بیش قیمت اُس نے بھیجے تھے۔ لیلی[2] مجنوں خاقان کبیر منوچہر بادشاہ شروان کے نام سے سنہ ۵۹۲ھ میں لکھی اور شیریں[3] خسرو اور ہفت[4] پیکر یعنی بہرام گور اتابک قزل ارسلاں کے نام سنہ ۵۹۳ھ میں لکھی اور سکندر نامہ نہایت پرزور کتاب اور تصنیف اخیر بنام طغرل شاہ سلجوقی کے ہے سنہ ۵۹۷ھ میں لکھی۔ اس کو شرف نامہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا تو افسانہ سکندر نامہ مشہور

ہفت: مفتاح ا

ہے۔ دوسرا اور تیسرا بمنزلۂ ایک مثنوی کے ہے اہلِ عقل کے نزدیک مخزن اسرار سب سے بہتر کتاب ہے کیونکہ باوجود نصائح خالص کے اعلےٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر ہے بباعث لطافت اور باریکی معانی کے اہلِ فن اس کو گنبد بے در کہتے ہیں۔ مصنّف خود کہتا تھا کہ اس کتاب میں مَیں نے انتہای درجہ کی موشگافی کی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی جگہ ابرو کو ہلال لکھا ہے تو اس کے لئے بڑھاپے کے سبب سے سفیدی کا اشارہ ضرور کیا ہے۔ سکندر نامہ نے بہت ہی رواج پایا۔ اگرچہ قصّہ سب صحیح نہیں لیکن زبان فارسی میں بے نظیر ہے۔ اُس کا نام اقبال نامۂ اسکندری اور خسرو نامہ بھی ہے۔ کشمیر و کابل وغیرہ میں شیرین خسرو بھی کتب تحصیلی میں داخل ہے۔ اگرچہ خاص و عام میں سوائے خمسہ کے اور کلام ان کا رائج نہیں لیکن دولت شاہ کہتا ہے کہ بیس۲۰ ہزار شعر دیوان کے بھی ہیں اور ایک قصّہ ویس رامین کا ہے کہ محمود ابن محمد ابن ملک شاہ کے نام سے لکھا تھا لوگ اُسے تصنیف نظامی عروضی کہتے ہیں اور یہ غلط ہے۔ اکثر مصنّفوں کی رائے یہ ہے کہ ابتدا کی مشق ہے ۵۷۶ھ میں ۸۴ برس کی عمر میں شہر گنجہ میں فوت ہوئے۔ مجمع الواصلین اور حبیب السیر میں ۵۹۲ھ سال فوت لکھا ہے۔ لیکن چونکہ خاتمۂ سکندر نامہ میں وہ خود کہتے ہیں کہ ۱۴ محرم کو دو پہر ڈھلے ۵۹۷ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اس واسطے معلوم ہوا کہ دونوں بے خبر ہیں۔ سکندر نامۂ بحری اُس کے بعد مرتب ہوا ۰

دیوان غزلیات چونکہ نایاب ہے اس واسطے چند اشعار اس میں سے لکھے جاتے ہیں ۰

نظم

جوانی بر سر کوچ است دریاب ایں جوانی را	کہ کس ہرگز نمے یابد دوبارہ زندگانی را
خمیدہ پشت ازاں گشتند پیرانِ جہاندیدہ	کہ اندر خاک مے جویند ایامِ جوانی را

غزل

یال

جہاں تیر است و رہ مشکل جبینت را عیاں درکش	زمانے رخشِ ہستی را بخلوت گاہِ جاں درکش
کلاغانِ طبیعت را ز باغِ انس بیروں کن	ہمایانِ سعادت را بدامِ امتحاں درکش

چو خاص الخاص جاں گشتی ز صورت پاے بیروں کن
ہزاراں شربت معنی بیکدم رایگاں درکش

گراں جانی مکن ہرگز کہ در بزم سبک روحاں
چو ساقی گرم رو گردد سبک رطل گراں درکش

چو سست حکمتش گشتی فلک را خیمہ برہم زن
ستون عرش در جنباں طناب کہکشاں درکش

طریقش بے قدم میرو چمالش بے نظر مے بیں
حدیثش بے زباں میگو شرابش بے دہاں درکش

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر بروں دادی
کسے رمزت نمے داند زباں درکش زباں درکش

انتخاب قصاید جو کہ آتشکدہ سے لکھے گئے :-

ہم جرس جنبید و ہم در جنبش آمد کارواں
کوچ کن زیں خیل خانہ سوئے دار الملک جاں

شحنۂ ما دانش آنکہ حرص در ہمسائگی
رستم مازندہ آنکہ دیو در مازندراں

ہم زمیں را با خلایق ناموافق شد خراج
ہم فلک را با کواکب نامناسب شد قراں

زیں قراں ایمن شوی چوں چنگ در قرآں زنی
مہر قرآں جوے کامد مہدی آخر زماں

ہر چہ نز قرآں طرازی بر فشاں زاں آستیں
ہر چہ نز ایماں بساطی در نورد از آستاں

فرقہا باشد میان آہنی و آہنی
کز یکے زیں نعل سازند از یکے دیگر سناں

اصل ہندو در سیاہی یک نسب دارد ولیک
ہندوئے را دزد یابی ہندوئے را پاسباں

درم قہہاے خاک آلودہ یابی روشنی
پیرہ زن زیں روئے کرد آتش بجا کستر نہاں

چند ازیں سلطان و سلطان بند تر از تو سلطان
بندۂ او شو کہ او شد صاحب سلطاں نشاں

دست عدلے را کہ آری بر سر یک زیر دست
در لحد خورشید تابی در قیامت سایباں

ظالماں را در قیامت خصم باشد مملکت
مضرعاں را در مساحت چاہ باشد نردباں

گر ہمہ جر لاب باشد آب جوئے کس مخور
در ہمہ تسبیح باشد نقش نان کس مخواں

چونکہ آب دیدہ داری از ضعیفی باک نیست
زانکہ مروارید را بار یک بہتر ریسماں

پردہ بردار از زمیں بنگر چہ بازی میرود
با عزیزان زمانہ زیر پردہ ہر زماں

تا بجز من خار یابی بر کلاہ یزدجرد
تا بدامن خاک بینی بر سر نوشیرواں

چند گوئی کعبه را کاینک بخدمت میرسم — چون نخوانندت هنوز از دور خدمت میرسان

سیم را رونق نخیزد تا برون ناید ز سنگ
لعل را قیمت نباشد تا برون ناید ز کان

ملک الملوک فضلم بفضیلت معانی — زمی و زمان گرفته بمثال آسمانی
نفس بلند صوتم جرس بلند صیتی — قلمم جهان نوردم علمم جهان ستانی
سر همتم رسیده بکلاه کیقبادی — بر جستنم گذشته ز پرند کورخانی
سخن از من آفریده چو فتوت از مروت — هنر از من آشکارا چو طراوت از جوانی
غزلم بسمعها در چو سماع ارغنونی — نکنم بدو فها در چو شراب ارغوانی
حرکات اختران را منم اصل و او طفیلی — طبقات آسمان را منم آب و او اوانی
نزنم بخیره طبلی چو زنم بود عروسی — نکنم بخطبه لحنی چو کنم بود اغانی
مهم و چو مه نگیرم کلف سیاه روئی — درم و چو در ندارم برص سفیدرانی
باجازت لب من دل خلق باز خندد — چو شگوفهٔ ریاحین بهوای مهرگانی
اگر این نشاط گوهر نفحات من نباشد — که زند در معنی که خورد مئی مغانی
چو صدف حلال خوارم چو گهر حلال زاده — ز حرام زاده دورم شب و روز در زبانی
ولد الزناست حاسد منم آنکه اختر من — ولد الزنا کش آمد چو ستارهٔ یمانی
سر آن جریدهٔ بر نه در آن قصیده بکشا — که برند نفقه فضلا به ارمغانی
شبهی چو در خزینهٔ حکمم گهرفشانی — گهری نه در خریطهٔ حکمم صدف و هانی
دل و دین شکسته وانکه هوسم زنا بجوئی — سر و پا برهنه وانکه سخنم ز مرزبانی
ملکا و پادشاها روشی کرامتم کن — که بدان روش بگردم ز بدی و بدگمانی
حرمم تو آمد این دل ز حسد نگاهدارش — که فرشته با شیاطین نکند هم آشیانی
ردیم مکن که خردم خللم مبین که خاکم — به بدان نهاد طبعم دو دلی و دو زبانی
ز گناه عذر بگذر بنواز و رحمتی کن — بنجا سلتی که بینی بضرورتی که دانی

همه ممکن الوجودی رقم هلاک دارد — توکه واجب الوجودی ابدالابد بمانی
بطفیل طاعت تو تن خویش زنده دارم — چو نباشد این سعادت نه من و نه زندگانی
اگر از نظامی آمد گنهیش عفو گرداں — کہ کس ایمنے ندارد ز قضائے آسمانی

تو رساندنش بادل بسعادت وجودش
چو نفس بآخر آید بشہادتش رسانی

دوش رفتم بخرابات و مرا راه نبود — میزدم نعره و فریاد کس از من نشنود
یا نبُد ہیچکس از باده فروشاں بیدار — یا نه من ہیچکسم ہیچکسم در نگشود
پاسے از شب بگذشت بیشتر یا کمتر — رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است دریں وقت کرا میخواہی — بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوے — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نگشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند — کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود
ایں خرابات مغانست درو رندانند — شاہد و شمع و شراب شکر و نائے و سرود
ہرچہ در جملہ آفاق درانجا حاضر — مومن و ارمنی و گبر و نصارے و یہود

گر تو خواہی کہ دل از صحبت ایناں بزنی
خاک پاے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

براہش بیقدم میرو جمالش بینظرے بیں — حدیثش بیزباں بگو شرابش بیدہاں درکش
نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر بروں دادی — کسے رمزت نمیداند زباں درکش زباں درکش

تدبیر کنم ہر شب تا دل ز تو برگیرم — چوں روز برآرد سر مہر تو ز سر گیرم
دل با تو برآویزم کامیختہ با جاں — جان دگرم باید تا دل ز تو برگیرم

شب بہ تنہائی بکوئے دوست بدناماں روند — نیکناماں را مسلّم نیست تنہا آمدن

ایں دولتِ سرمستم ہشیار شود روزے	ویں بخت گراں خوابم بیدار شود روزے
ہم باز شود ایں در ہم روز شود ایں شب	دلبر نہ چنیں ماند دلدار شود روزے
خصمے کہ بزعم او امروز نوازندشش	در چشم عزیز او ہم خوار شود روزے

کافر شدم از دستش باشد کہ بایں دستاں
زلفش بمیانم بر زنار شود روزے

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

نام اس صاحب دل کامل کا مصلح الدین باپ کا نام عبداللہ تھا چونکہ اتابک سعد زنگی کی سلطنت میں ملک سخن پر اس کی فرمانروائی تھی اس واسطے سعدی تخلص کیا تھا۔ یہ بھی واضح ہو کہ اتابک لغت میں بمعنی استاد ہے۔ چونکہ سعد زنگی سنجر بادشاہ ایران کے دادا کا استاد تھا اس واسطے یہ لقب ان کا خاندانی ہوگیا۔ ترکی میں آتا باپ کو کہتے ہیں اور بیگ تعظیم کا لفظ ہے۔ جیسے صاحب۔ اس کا مخفف اتابک ہوگیا۔ باپ شیخ کا اتابک مذکور کی سرکار میں ملازم تھا اور بھائی بادشاہی ڈیوڑھی پر دوکان بقالی کی کرتا تھا۔ حضرت شیخ نے نظامیہ (بغداد کے مشہور مدرسہ) میں تعلیم پائی تھی کہ عمدہ نمونہ خوبی و درستی اسلام کا تھا۔ خود کہتے ہیں ؎

مرا در نظامیہ ادرار بود	شب و روز تلقین و تکرار بود

اور ابو الفرح ابن جوزی عالم مشہور کے شاگرد تھے۔ اہل تاریخ نے ان کی عمر کو تین حصہ میں تقسیم کیا ہے ۳۰ برس تحصیل علم کی ۳۰ برس تک ولایتہائے نزدیک دور میں پھر کر جو کچھ کتابوں میں پڑھا تھا اس کا تجربہ حاصل کیا۔ باقی عمر بیٹھ کر جمعیت خاطر اور یاد الٰہی کا لطف حاصل کیا۔ مدت تک شام اور بیت المقدس کے جنگلوں میں

سقائی کی۔ ۱۴ دفعہ (جن میں کئی مرتبہ پیادہ پا تھے) حج کیا۔ شہاب الدین سہروردی اپنے مرشد کے ساتھ سفر دریا کیا چنانچہ کہتا ہے ؎

مرا پیر دانائے مرشد شہاب	دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش	دوم آنکہ بر غیر بد بیں مباش

اس کے علاوہ ملک ملک کی سیر کی ہندوستان میں آئے۔ سومنات کے مندر میں پجاری بن کر رہے۔ شہر کو چھوڑ جنگلوں میں پھرتے رہے۔ وہاں سے اہل فرنگ کی قید میں پڑے بیگار میں پکڑے گئے۔ یہودیوں کے ساتھ طرابلس کے جنگل میں مٹی ڈھوئی کسی دوست نے ۱۰ روپیہ کو وہاں سے چھڑایا۔ ایک بدخو جورو کے پنجۂ ظلم میں گرفتار ہوئے۔ ایک زمانہ میں کوچہ گردی اور عشق بازی بھی کی۔ غیاث الدین بلبن بادشاہ دہلی کے فرزند اباقان نے (جو کہ تخت نشینی سے پہلے سنہ ۶۸۱ھ میں تاتاریوں کے ہاتھ سے مارا گیا) ملتان سے اپنے عہد حکومت میں دو تین بار خرچ سفر بھیج کر طلب کیا اور تجویز کی کہ خانقاہ بنا کر چند گاؤں مصارف کے لئے مقرر کر دے۔ شیخ نے ہر دفعہ کچھ کچھ تصنیفات اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی بھیجی اور امیر خسرو کی (کہ اس زمانہ میں ابتدائے جوانی اور عنفوان شاعری میں تھا) بہت تعریف و سفارش لکھی مگر آپ نہ آئے۔ دولتشاہ اور صاحب ہفت اقلیم لکھتا ہے کہ شیخ کی شیخ عبدالقادر جیلانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ لیکن شیخ عبدالقادر جیلانی کی حیات و ممات یہ ہے ؎

نفائس الم

سنینش کامل و عاشق تولد	وفاتش داں تو معشوق الٰہی

۵۶۱

اور شیخ سعدی کا تولد ۵۷۱ھ سے کم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بعضے لوگ کہتے ہیں کہ شیخ اور حافظ شیراز ماموں بھانجے تھے یہ بھی غلط محض ہے ؎

مفتاح التو

بوستان سنہ ۶۵۵ھ اور گلستان سنہ ۶۵۶ھ میں لکھی۔ یہ دونو نسخہ پند و نصیحت بہبود دنیا و آخرت سے مالا مال ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ میزان منشعب بھی انہیں کی تصنیف ہے لیکن کسی کتاب سے سند نہیں ملتی۔ تعجب ہے کہ پند نامہ یعنی کریما ایران

میں نہیں۔ لیکن وہاں کے اکثر اہل کمال سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کلام سعدی کا
معلوم ہوتا ہے۔ شاید ہندوستان میں آکر کہی اور یہیں چھوڑ گئے۔ بہرصورت ان کے
کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بات کو خود برتا ہے اور جو کچھ لکھا ہے سمجھ کر لکھا
ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اس فصاحت اور اختصار اور تاثیر سے کہی ہیں کہ جب کسی
موقع پر فقرہ یا شعر پڑھا جاتا ہے پھر گفتگو کی حاجت نہیں رہتی۔ خصوصاً گلستان
اس کی تعریف اسی قدر کافی ہے کہ ترجمہ اس کا (انگریزی و لاطینی و فرانسیسی و جرمنی) فلوور آف پرشین لٹریچر
عربی و ترکی و اردو میں کیا گیا۔ سب لوگوں نے مثلاً مُتَتَبِّعی و جُوَینی نے نگارستان
مولوی جامی نے بہارستان۔ امیر خسرو نے شکرستان۔ مرزا قاآنی ملک الشعرائے حال
ایران نے پریشان لکھی لیکن سب کہتے ہیں کہ گلستان سے کچھ نسبت نہیں۔ سب طرح
کی نظم و نثر اور بہت سے قصاید فصیحہ عربی کے غرض کل ۲۰ ہزار بیت ان کی کلیات
میں ہے۔ جسے اہل کمال نمکدان فصاحت کہتے ہیں۔ خصوصاً غزل میں ان کی تقلید
اب تک اہل ایران فخر جانتے ہیں اور انہیں پیغمبر سخن کہتے ہیں۔ اس کے دیکھنے سے اے جیل صاحب
یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں عشق کا رنگ زیادہ تھا جو انجام کو آزادی اور دل بردا شتگی
اور قناعت کی منزل کو پہنچ گیا۔ متانت کلام کا حال نواد پر لکھا گیا۔ چند جزو ہزلیات کی
نظم میں اور ایک دو جزو نثر میں ایسے لکھے ہیں کہ کوئی مرتبہ تمسخر اور فحش کا باقی نہیں رہا
لیکن آخر عمر کے اشعار میں اُس سے ندامت بھی ظاہر کرتے ہیں۔ بڑا سبب انکی شوخی اور ر آف لٹریچر
آزادی کا یہ تھا کہ اہل عیال کچھ نہ تھے جو ہمچشموں کی حیا یا فکر و تردد پاس آتے۔ اُس
جفا کار جورو کے پھندے سے نکل کر پھر اس بلا میں نہیں پڑے۔ اکثر باتیں ان کی
بطریق لطایف و ظرایف کتابوں میں اور ان کے کلام میں بھی مذکور ہیں۔ لیکن چونکہ یہ
ہدیہ بزرگان دولت کی نظر سے گزریگا ادب اجازت نہیں دیتا کہ زبان قلم اُس سے
آشنا ہو۔ غرض نیک یا بد ہر بات زمانہ کی اپنے تجربہ میں آئی ہوئی تھی اس لئے
جس کوچہ میں اور جس طریق میں جاتے ہیں ایسی چپتے کی بات کہتے ہیں کہ اُس ڈھنگ

کے آدمی کے دل کو لگ جاتی ہے خاص و عام صغیر و کبیر سب پسند کرتے ہیں۔ اور جب تک زندہ تھے ہر چمن میں گل اور ہر محفل میں گلدستہ تھے۔ ایک دفعہ حج سے پھرے ہوئے آتے تھے۔ تبریز میں بعضے امیروں اور رشتہ داروں سے ملنے کو گئے۔ سلطان آبا قآن نے سن کر بلایا بہت تعظیم و تکریم کی اور کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔ شیخ نے کہا کہ جب دنیا سے انسان جاتا ہے تو یا ثواب لے جاتا ہے یا عذاب تم امید و بیم میں رہو اور حسب فرمایش اسی وقت نظم کر کے سنایا۔ بادشاہ اس کلام پر اثر سے آب دیدہ ہوا اور پوچھا کہ میں کون سی جانب میں ہوں۔ شیخ نے کہا کہ یہ میں نہیں کہہ سکتا تم اپنا حال خود مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ اس نے کئی مرتبہ یہی سوال کیا شیخ نے یہی جواب دیا۔ دولت شاہ اس مقام پر لکھتا ہے کہ بقال اور قصاب کو بھی آج کوئی اس بے باکی سے نصیحت نہیں کر سکتا۔ مگر سعدی خود کہتا ہے اور سچ کہتا ہے ؎

نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ		سخن ملکیست سعدی را مسلّم	

مفتاح التواریخ

ایک دفعہ شمس الدین تازی کے عہد میں بموجب رواج سلطنت کے کھجوریں خراج شاہی میں آئیں اور خزانہ سے اہل سپاہ کو عوض زر تنخواہ کے ملیں انہوں نے بزبردستی بقالوں کو دیں اور قیمت گراں وصول کرنی چاہی۔ شیخ کے پاس ان کا بھائی آکر نالاں ہوا۔ انہوں نے ایک رقعہ منظوم بنام حاکم لکھا:۔

اشعار منتخب

احوال برادرم بہ تحقیق	دانم کہ ترا خبر نباشد
خرمائے بطرح میدہندش	بخت بد ازیں بتر نباشد
اطفال برادرم مرد درویش	خرما نخرند و زر نباشد
آنکہ تو محصلے فرستی	ترکی کہ ازاں مفر نباشد
چنداں بزنندش اے خداوند	کز خانہ رہش بدر نباشد

اے صاحب من بغور او رس		لطفے بہ ازیں دگر نباشد	

ملک شمس الدین پڑھ کر بہت ہنسا اور حکم دیا کہ کھجوریں معاف اور جن بقالوں سے روپیہ وصول ہوا انہیں اسی وقت واپس کردو۔ شیخ کے پاس خود آیا۔ عذر معذرت کی اور دعائے خیر چاہی۔ چونکہ جانتا تھا شیخ آپ کچھ نہیں لیتا اس واسطے کچھ زر نقد بھی سامنے رکھا اور کہا کہ میں نے سنا ہے آپ کا بھائی بہت غریب ہے اسے دیدیجئے۔

غرض سنہ ۶۹۰ یا ۹۱ ہجری میں شہر شیراز میں شیخ فوت ہوئے۔ لفظ خاص تاریخ فوت ہے اور بسبب مقبرہ کے وہ مقام اب تک سعدیہ مشہور ہے۔ عمر ان کی بعضے ۱۰۲ اور بعضے ۱۲۰ برس کہتے ہیں لیکن چونکہ شیخ گلستاں میں خود کہتا ہے کہ ابن جوزی میرا شیخ مجھے ناچ رنگ دیکھنے کو منع کرتا تھا اور مجھے جوش جوانی غالب تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سن بلوغ کو پہنچ گئے تھے اور چونکہ ابن جوزی سنہ ۵۹۷ھ میں فوت ہوا فاصلہ استاد اور شاگرد میں ۱۰۶ برس کا ہے تو ظاہر ہے کہ اس وقت عمر شیخ کی ۱۸ یا ۲۰ برس کی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ ہوگی غلطی سے نقطہ کا پس وپیش ہوا ۱۲۰ صحیح ہے۔

فرینکلن صاحب سنہ ۱۷۸۶ء میں وارد شیراز ہوئے۔ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ شہر سے شمال ومشرق میں آدھ کوس کے فاصلہ پر ایک باغ دامن کوہ میں شیخ کا مزار ہے۔ عمارت مربع عالیشان بنی ہے۔ ایک جانب دو محرابیں برابر ہیں جسکے دست راست پر قبر شیخ کی ہے طول ۴ ہاتھ عرض ۲ ہاتھ۔ ایک طرف چند فقروں میں شیخ کا حال بخط نسخ پتھر پر کندہ ہے۔ اب تک عمارت کی خوبی میں فرق نہیں آیا۔ قبر پر ایک چتر طلاکار گنبد نما سیاہ لکڑی کا ہے اس پہ شیخ کی ایک غزل لکھی ہے کلیات نہایت خوش خط لکھا ہوا مزار پر رکھا ہے۔ خاتمہ

	لطیفہ	

شیخ سعدی کا ایک شعر حمد الٰہی میں ہے ؎ :-

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

معتقد اُن کے مشہور کرتے ہیں کہ جس رات شیخ نے یہ شعر کہا ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے طبقہاے نور نازل ہوتے ہیں اور معلوم ہوا کہ شیخ سعدی نے جو شعر حمدِ الٰہی میں کہا ہے یہ اُس کا صلہ ہے ؏

فیضی (برادر ابو الفضل وزیر اکبری) اپنی کتاب نلدمن میں حمدِ الٰہی کے اشعار کہتا تھا اتفاقاً ایک شعر لکھا کہ ؎

در ہر بُنِ مو کرے نہی گوش فوارۂ فیضِ اوست در جوش

لطافتِ مضمون و آبداریِ الفاظ پر بہت نازاں ہوا اور شیخ کے شعر کا خیال کرکے آسمان کی طرف مُنہ کیا کہ دیکھوں مجھے اس کا صلہ درگاہِ الٰہی سے کیا ملتا ہے۔ اتفاقاً کوئی طائر اُڑا جاتا تھا اُس نے اوپر سے بیخال کردی فیضی بہت خفا ہوا اور کہا کہ واہ سبحان اللہ۔ قدردانی عالمِ بالا معلوم شد ؏

غزل

ما گدایانِ خیلِ سلطانیم شہر بندِ ہوائے جانانیم

چوں دلارام میزند شمشیر سر بباذیم و رخ نگردانیم

دوستاں در ہوائے صحبتِ دوست زر فشانند و ما سر افشانیم

مر خداوند عقل و دانش را عیب ما گو مکن کہ نادانیم

ہر گلِ نو کہ در جہاں آید ما بعشقش ہزار دستانیم

تنگ چشماں نظر بمیوہ کنند ما تماشا گرانِ بستانیم

خود پرستاں نظر بشخص کنند ما در آثارِ صنعِ یزدانیم

ہر چہ گفتیم جز حکایتِ دوست در ہمہ عمر ازاں پشیمانیم

سعدیا بے وجودِ صحبتِ یار ہمہ عالم بہیچ نستانیم

ترکِ جانِ شریف بتواں گفت ترکِ یارِ عزیز نتوانیم

شمس الدین محمد خواجہ حافظ شیرازی

نام اس بزرگ کا شمس الدین محمد وطن فصاحت آباد شیراز - آل مظفر کے زمانِ سلطنت میں تھا - لیکن کسی بادشاہ یا امیر وزیر کی نوکری نہیں کی - آزادی طبیعت قناعت خاطر سے گزران کرتے رہے - ان کے اور شیخ سعدی کے حال سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی حقیقت کو یہ لوگ خوب سمجھ گئے تھے اور جان لیا تھا کہ جو کچھ ہے چند روزہ ہے اُس میں بھی حال یہ ہے - اپنی کوشش اور کاہش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اثر دینے والا کوئی اور ہے - اُس کے علاوہ جس نے ہمیں پیدا کیا اُس کی غرض ہم کو یہاں بھیجنے سے کچھ اور ہے - ہمیں اس کی مرضی پر راضی رہنا چاہیئے کہ اطاعت کا یہی حق ہے - اُس کے علاوہ یہاں اگر آرام بھی ہے تو اسی میں ہے ؎

کار خود گر بخدا باز گزاری حافظ   اے بسا عیش کہ از بخت خداداد کنی

علم قرات میں اپنے زمانہ میں نظیر نہ رکھتے تھے اور بہت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے - ان کا معمول تھا کہ شب جمعہ کو مسجد شیراز میں پھرتے رہتے تھے - اور رات بھر میں ایک قرآن ختم کرتے تھے - اگرچہ صوفی مذہب تھے لیکن کسی کے مرید نہ تھے - امیر تیمور نے چاہا تھا کہ میرے وقائع تاریخ کو اپنے قلم فصاحت سے تحریر کریں آزادی طبیعت نے گوارا نہ کیا - جبکہ امیر تیمور شیراز میں آیا خواجہ حافظ سے بھی ملاقات کی - لباسِ خاکساری میں زمین پر بیٹھے تھے - امیر نے بطریق ظرافت کہا کہ آپ کا مطلع غزل کا میں نے سُنا ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را   بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

صدہا شہر تباہ کر کے میں نے سمرقند و بخارا کو آباد کیا اور آپ نے اُنہیں ایک خال پہ بخشدیا۔ خواجہ حافظ نے اپنے پھٹے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہاکہ ایسی ہی فضول خرچیوں سے تو یہ حال ہو رہا ہے ؎

دیوان ان کا نصائح و حکمت سے مالا مال ہے۔ البتہ مضامین نصیحت کو بھی لباس عشق میں کہا ہے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جان دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

لیکن فحش و ہزل بالکل نہیں۔ یہی سبب ہے کہ خاص و عام سب پسند کرتے ہیں۔ عالمگیر نے پڑھنا پڑھانا اس کا بالکل مکتبوں سے موقوف کروا دیا۔ مرات الخیال
لیکن باوجود اس کے ہر وقت اپنے سرہانے رکھتا تھا۔ جب لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ معانی اس کے سراسر حکمت و پند ہیں لیکن عوام ظاہری معنوں میں دھوکا کھاتے ہیں اس لئے یہی مناسب ہے۔ ان کے دیوان کو لسان الغیب نفحات
اور ترجمان الاسرار کہتے ہیں۔ اور اکثر جاہل و نادان اُس میں فال بھی دیکھتے ہیں اور مشہور کیا ہے کہ شاخ نبات ایک عورت پر خواجہ عاشق تھے چنانچہ بروقت فال دیکھنے کے اُس کی قسم دے کر کہتے ہیں کہ یا خواجہ حافظ تمہیں قسم ہے شاخ نبات کی کہ ہمارے حصول مطلب سے ہمیں صاف صاف خبر دیجئے۔ باوجودیکہ فارسی کتابوں میں بھی اس قسم کی خلاف عقل باتیں بہت ہوتی ہیں۔ لیکن کسی تاریخ یا تذکرہ سے یہ بات بالکل نہیں پائی جاتی ؎

حاکم بنگالہ نے ایک دفعہ انہیں طلب کیا تھا لیکن شیراز نہ چھوٹ سکا۔ حسب فرمایش اُس کے غزل لکھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

آخر سنہ ۷۹۱ھ میں شہر شیراز میں فوت ہوئے اور ایک سبزہ زار میں جس کا نام

مصلّٰی ہے اور اُس میں نہر رکنا باد جاری ہے دفن ہوئے ۔ خاکِ مُصلّٰی (۷۹۱) سے تاریخ بھی نکلی ہے ۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ یہ شیخ سعدیؔ کے بھانجے تھے یہ بھی غلط محض ہے سوائے دیوان کے کہ زبان فارسی کی فصاحت کا دریا ہے کوئی اور نمونہ استعداد علمی کا نہیں دیکھا گیا ۔ ان کے کلام کی خوبی اور مضمون کی لطافت کیا بیان کیجاوے کہ وہ خود شعرا کے واسطے ایک مضمون جداگانہ ہوگئی ہے چنانچہ اسی واسطے اندراج ان کے اشعار پسندیدہ کا ملتوی رکھ کر ایک شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ کسی استاد نے کہا ہے منتخب

ہلاکِ حسنِ خداداد دلبرام کہ سراپا	چو شعرِ حافظِ شیراز انتخاب ندارد

غزل

در دیر مغاں آمد یارم قدحے در دست	مست از مے و میخواراں از نرگسِ مستش مست
در نعل سمند او شکلِ مہِ نو پیدا	وز قدِّ بلند او بالاے صنوبر پست
از بہر چہ گویم ہست از خود خبرم چون نیست	وز بہر چہ گویم نیست با او نظرم چون ہست
شمعِ دلِ دمسازاں بنشست چو او برخاست	افغاں ز نظربازاں برخاست چو او بنشست
گر غالیہ خوشبو شد در گیسوے او پیچید	ور وسمہ کمانکش شد در ابروے او پیوست

باز آ کہ باز آید عمرِ شدۂ حافظ
ہر چند کہ ناید باز تیرے کہ بشد از شست

ابو اسحٰق اطعمہ

جمال الدّین نام کنیت ابو اسحٰق تھی اسی کو تخفیف کر کے اشعار میں بجائے تخلّص کے داخل کرتا ہے ۔ کوئی شعر اس کا کھانے کے ذکر سے خالی نہیں ایک دیوان تمام و کمال اسی التزام سے مرتب کیا ہے ۔ نام اس کا کنز الاشتہا رکھا ۔ اکثر

غزلیں حافظ کی غزلوں پر کہی ہیں اور اس کے مصرع اپنی غزل میں داخل کئے کہ دونو کا لطف دوچند ہوگیا۔ سب لوگ اس ظرافت کو پسند کرتے ہیں۔ اکثر رسالے بھی اسی مضمون کے تصنیف کئے۔ سعدی نے مناظرہ جنگ کے ہتھیاروں کا لکھا تھا۔ اس نے کھانوں کو لڑایا ہے۔ سبب اس ایجاد کا یہ ہے کہ حکام میں سے ایک شخص کی بھوک (خان آرزو) بند ہوگئی تھی۔ اس صاحب طبع نے بھوک کھلنے کے لئے یہ ہاضمہ کا نسخہ نکالا۔ ڈاڑھی (دولت شاہی) اس کی ایسی دراز تھی کہ حد سے زیادہ۔ صورت دیکھنے سے ہنسی آتی تھی۔ سکندر ابن عمر شیخ ابن تیمور کو اس کا کلام بہت پسند تھا اور اس پر بہت عنایت کرتا تھا۔ ایک دفعہ کئی دن کے بعد دربار میں آیا۔ شہزادے نے پوچھا کہ بسحق کئی دن بعد آیا کس کام میں تھا۔ عرض کی ایک دن روئی دھنکتا ہوں تین دن ڈاڑھی میں سے پھٹکیاں چنتا ہوں اور یہ شعر پڑھا ؎

منع مگس از پیشک قندی کردن	از ریش حلاج پنبہ بر داشتن است

(دولت شاہی) شہزادۂ مذکور بہت جوانمرد و بہادر تھا۔ بعد تیمور کے فتوحات متواتر حاصل کیں اور چاہا کہ کل سلطنت زیر حکم کر کے حکومت شخصیہ قائم کرلے۔ آخر شاہرخ پسر تیمور نے شکست دے کر گرفتار کیا۔ گوہر شاد خاتون اپنی پھوپھی کے کہنے سے اندھا کردیا کہ پھر فساد نہ کرسکے۔ دولت دنیا کی کیا بری بلا ہے کہ آدمی کو اندھا کردیتی ہے۔ نہ خدا کا خوف نہ بندوں کی شرم نہ خون کا جوش کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہ حادثہ ۸۱۷ھ میں واقع ہوا۔

اشعار منتخب

ہر آں ہریسہ کہ پیش از طلوع تنہا است	ہوائے آں بدل ہر کہ ہے ورزد باد است
کسے بجز ہر یک دانۂ نخود برسد	کہ قفل حقۂ گیپا بہ پاچہ بکشاد است
دگر مگوے کہ ناں نوعروس سفرہ است	کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است
نوشتہ است ز روغن بچہرۂ حبشی	کہ ایں سیاہ زبان مزعفر آزاد است

من آں نیم کہ زحلوا عناں بگردانم — کہ ترکِ صحبتِ شیریں نگار فرہاد است
بکارگاہ قطایف کہ رشتہ مے تابند — زلفظ پستہ شنیدم کہ روغن استاد است

حسد چہ میبری اے کاسہ لیس بر بسحاق
برنج زرد و عسل روزئے خدا داد است

بہ بیشم گر سحرگاہاں درآری صحن بغرا را — ببوئے نیکوئش بخشم سمرقند و بخارا را
کبابِ آہوئے فربہ اگر داری غنیمت داں — کنارِ آبِ رکنا باد گلگشت مصلیٰ را
جمالِ برۂ بریان و حسنِ دنبۂ فربہ — چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را
چہ آرائی بمشک و زعفراں رخسارِ پالودہ — برنگ و بو و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

بگو بسحاق وصفِ خوشۂ انگور شقالی
کہ بر نظمِ تو افشاند فلک عقدِ ثریّا را

میان ما و مزعفر محبت ازلی است — گواہ شربت قند و حلاوتِ عسلی است
چو نان و خربزہ بینی شہید کن خود را — کہ مرگہائے چنیں خوش دلیلِ زندہ دلی است
بدین قلیۂ شامیّ و ملّتِ حبشی — نخود بکوفتہ کردن نشانۂ دغلی است

نبود عالم و بسحاق ایں سخن مے گفت
کہ نان و گوشت قدیم است و جوع لم یزلی است

نمے گردم ز ذکرِ قلیہ خالی — بفکر بورقتم در کلّ حالی
سحر برخیز از بہر ہریسہ — و من طلب العلی سہر اللّیالی
درون دیگ داں خورشید شلغم — کانّ الشمس فی جوف اللیالی

چو از ہم مے درم مُرغ مسمّن
فما ادری یمیناً عن شمالی

ز بسکہ فرنیم اندر ضمیر مے آید — ز مطبخِ سخنم بوئے شیر مے آید
بیار جوشِ نانِ تنک کہ ہر ساعت — خیال رشتہ بدل ہمچو تیر مے آید

چو بوے کلہ برآمد صباح عقلم گفت | کہ ہر گزشت کہ بوئے عبیر مے آید

چہ خوردۂ بسر سفرۂ سخن بوسحاق
کہ گفتۂ تو چنیں دلپذیر مے آید

رگیپا پزاں سحر کہ سر کلّہ وا کنند | آیا بود کہ گوشۂ چشمے با کنند
چوں از درونِ خریزہ واقف نشد کسے | ہر کس حکایتے بتصوّر چرا کنند

مطبخی باز پیاز از جہت قیمہ خرید | تا دگر آب ز چشمم کہ رواں خواہد بود

روزہ داری و قناعت ہوسم ہست ولے | چشمکے مے زند آں ترّۂ بریاں کہ مپرس
کس بیالاے مزعفر نکند آتشِ تیزش | کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس

ہر زماں کہ دریابی نانِ گرم و بورانی | وقت را غنیمت داں آں قدر کہ بتوانی

خور در رواقِ ازرق چوں رو نہد بزردی | یاد آیدم مزعفر در صحنِ لاجوردی

امیر خسرو دہلوی

نام اس بادشاہِ ملکِ سخن کا یمین الدین اور ابو الحسین۔ امیر تیمور کا ہموطن تھا سیف الدین محمود باپ اس کا چنگیز خاں کے زمانے میں شہر کش[1] سے بھاگ کر ہند میں آیا۔ چونکہ قبیلۂ لاچین کے رؤسا میں سے تھا جو قرشی کے پاس رہتے ہیں۔

---

[1] یعنے کش کہ جس کو اب شہر سبز کہتے ہیں ؎

اس واسطے ناصرالدین محمود ابن شمس الدّین التمش بادشاہ دہلی نے ارکان دربار میں
داخل کیا۔ غیاث الدّین بلبن کی طرف سے چند روز سند صوبۂ پنجاب کی پائی۔
وہ قضائے الٰہی سے ایک لڑائی میں مارا گیا۔ خسرو اُس وقت ۹ یا ۷ برس کا
تھا خسرو کا بڑا بھائی یا نانا اُس کا بجائے اُس کے نوکری بادشاہی بجا لاتا تھا
اور اس کی پرورش بھی کرتا تھا۔ اہل تصوّف کی کتابوں میں اُس خیال کے
لوگوں نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ پیدا[1] ہوتے ہی باپ نے اسے قنداق کیا۔
اور اُس زمانہ کے ایک ولی مشہور تھے اُن کے پاس لے گیا۔ اُنہوں نے دُور
سے دیکھتے ہی کہا کہ تو صاحب کمال کو لئے آتا ہے کہ جو خاقانی سے کئی تیر آگے
بڑھ کر قدم ماریگا۔ سلطان نظام الدین اولیا کے دل میں ان کی گرمیٔ کلام کا ایسا اثر
ہوتا تھا کہ اشعار سُن کر مزے لیتے تھے اور کہتے تھے الٰہی اس ترک بچّے کے
سوزِ دل کا واسطہ میرے گناہ بخشدے۔ ان کے والد سے نقل کرتے ہیں کہ
جب بچپن میں ان کے کپڑے بدلتے تھے تو بدن کے کپڑوں میں سینے کے
مقام پر ایسا سیاہ داغ پڑ جاتا تھا جیسے جلے ہوئے کا نشان ہوتا ہے۔ خیر ان
باتوں کو تصدیق کریں یا نہ کریں مگر ان تاثیروں پر کلام ان کا گواہی دیتا ہے جب
بڑا ہوا اپنے باپ کے عہدے پر قائم ہوا۔ اُس کا نانا ۱۳۰ برس کی عمر میں مرا۔
اسپرنگر صاحب کہتے ہیں کہ حسن اپنے ایک دوست کی معرفت خسرو شاہزادہ
محمد سلطان ابن غیاث الدین بلبن کے دربار میں ملازم ہوا۔ حسن کو دوات داری کی
اور خسرو کو قرآن داری کی خدمت تھی۔ اگرچہ خسرو علم فاضلانہ یا طبع حکیمانہ نہ
رکھتا تھا لیکن نیکوکاری اور بے آزاری کو اپنا دستور العمل کیا تھا۔ عبادت اور
ریاضت کے ساتھ مذہب صوفیانہ اور بے تعصب رکھتا تھا۔ شاعری میں ایسا
نازک خیال اور صاحب اختراع کم پیدا ہوا ہے۔ بہت سے صنائع و بدائع میں خود

خسرو
م التواریخ

---

[1] قصبہ پٹیالی میں کہ آب گنگ کے کنارہ ہے وہاں پیدا ہوئے۔

صاحبِ ایجاد ہے۔ شاہ نظام الدین اولیا کا مرید خاص تھا۔ وہ بھی اس سے محبت بے حد رکھتے تھے۔ اپنی ہر تصنیف میں کچھ نہ کچھ اُن کی تعریف ضرور کرتا ہے۔ قصاید اس کے خاقانی و انوری سے مرتبہ میں کم نہیں بلکہ صنائع و بدائع تجنیس و ایہام وغیرہ میں متقدمین پر فایق ہے *

مثال قصیدہ

داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات	لالہ غلام روے تو صد برگ زیر بات
چوں برہمن بدید رخ خوبت اے صنم	زنار را گسست و لکد زد بروے لات

غزل نہایت شیریں کہتا ہے ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت	شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

دیوان اُس کا ایک لاکھ تیس ہزار بیت ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ اشعار میرے ۴ لاکھ سے زیادہ اور ۵ لاکھ سے کم ہیں۔ اعجاز خسروی نثر میں ایسی کتاب لکھی ہے کہ اسم با مسمّٰی ہے۔ خمسۂ نظامی پر خمسہ لکھا ہے اور ایسا کہا ہے کہ دولت شاہ وغیرہ تمام سخندان اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ بایسنغر امیر تیمور کے پوتے کی بھی یہی رائے تھی۔ دیباچہ سلطان علاؤ الدین کے نام پر ہے اور کل دو برس میں لکھا ہے۔ خوبی اُس کی کیا بیان کی جاوے خسرو خود کہتا ہے ؎

دبدبۂ خسرویم شد بلند	زلزلہ در گور نظامی فگند

خمسہ میں اول مطلع الانوار ہے۔ مطلع اُس کا یہ ہے ؎

خطبۂ قدس است بملک قدیم	بسم اللہ الرحمن الرحیم

اور سنہ تصنیف اور تعداد ابیات ان اشعار سے معلوم ہوتی ہے ؎

در ہمہ بیت آوری اندر شمار	سی صد و دہ بر شمر و سہ ہزار	۳۳۱۰
سال کہ از چرخ کہن گشتہ بود	از پس ششصد نود و ہشت بود	
صبح کہ خورشید جنابش نوشت	مطلع انوار خطابش نوشت	

از اثر اخترِ گردون خرام | شد بدو ہفتہ مہ کامل تمام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہفتہ میں یہ کتاب لکھی ہے ٭

۲ - شیرین خسرو کا آغاز ؎

خداوندا دلم را چشم بکشا | بمعراجِ یقینم راہ بنما

بعد ازاں ایک جگہ دیباچہ میں کہتا ہے ؎

پس از کلکم چکیدہ شربتِ نو | کہ نامش کردہ ام شیرین خسرو
در آغازِ رجب فرخ شد این فال | ز ہجرت ششصد و ہشت و نود سال ۶۹۸
وگر پرسی کہ بیتش را عدد چیست | چہار الف و چہار است و صد و بیست ۴۱۲۴

۳ - لیلیٰ مجنوں (آغاز) ؎

اے دادہ بدل خزینۂ راز | قفل از تو شدہ خزینہ پرداز
نامش کہ ز غیب شد مسجّل | لیلیٰ مجنوں بعکس اوّل
تاریخ ز ہجرت آنچہ بگذشت | سالش نود است و ششصد و ہشت ۶۹۸
بیتش بشمار راستی ہست | جملہ دو ہزار سہ صد و شصت

۴ - آئینۂ سکندری (آغاز) ؎

جہاں پادشاہا خدائی تراست | ازل تا ابد پادشاہی تراست

۱۹۴ صفحہ فی ۳۸ بیت ٭

۵ - ہشت بہشت ؎

ہمہ بیتش بعرض گاہ شمار | سہ صد و پنجہ و دو و سہ ہزار ۳۳۵۲
سال ہجرت یکے و ہفصد بود | کیں بنا بر وسر بہ چرخ کبود ۷۰۱

کہتے ہیں کہ گلستان پر بھی شکرستان کہی تھی لیکن اُسے رواج نہ دیا۔ دیوان اپنا بلحاظ اپنی تمام عمر کے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے - تحفۃ الصغر - وسط الحیوٰۃ - غرّۃ الکمال - بقیّہ نقیّہ - اس کے علاوہ اعجاز خسروی - نقد الفتوح وغیرہ -

خوشگو کہتا ہے کہ ۹۹ کتابیں اُس کی تصنیف ہیں اُن میں سے نُہ سپہر تاریخ دہلی مسافت ہند خزائن الفتوح چند رسالے علم موسیقی میں ہیں۔ بعض خالق باری کو بھی اُسی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار چار شعر اُس کے ایک جگہ پائے گئے اُس میں تخلّص اُس کا سلطانی ہے۔ سلطان محمد عرف قاآن ملک جسے خان شہید بھی کہتے ہیں۔ غیاث الدین بلبن بادشاہ دہلی و پنجاب وغیرہ کا بیٹا تھا اور باپ کی طرف سے لاہور و ملتان سے لیکر ٹھٹہ تک اور کنارۂ دریائے شور تک ملک اُس کے زیر حکم تھا۔ تاتار ترک کہ جن میں اُس وقت تک بھی اسلام نہیں پہنچا تھا۔ اور کفار مغول مشہور تھے اپنی قدیمی عادت کے بموجب اکثر ہندوستان میں لوٹ مار کرتے تھے۔ ایک دفعہ اینمر مغول ۳۰ ہزار آدمی کی جمعیت لے کر آیا اور راوی سے اُتر کر فتنۂ عظیم ملک میں ڈال دیا۔ لاہور کے حاکم نے قاآن ملک کو عرضی لکھی۔ اتفاقاً دربار میں پڑھنے والے نے ۳۰ ہزار کو ۳ ہزار پڑھا۔ شاہزادہ اسی سامان سے فوج لے کر آیا اور راوی کے پار اُتر کر باغ سریہ کے پاس ایک بڑے گاؤں کو پشت پر رکھ کر لڑائی شروع کی۔ خلاصہ یہ کہ انجام کو خود مارا گیا اور تمام فوج تباہ ہوگئی۔ اس موقع پر کہ امیر خسرو بھی ندیموں میں داخل تھا۔ اور شاہزادہ کے ساتھ جنگ میں شریک تھا خود لکھتا ہے کہ ایک ترک کے نوکر کی بیگار میں پکڑا گیا۔ چنانچہ لشکر کے ساتھ گھوڑوں کے توبڑے اور جھول اُٹھا کر چلنا پڑتا تھا جان بچ گئی یہی غنیمت ہے۔ اس حال کو اور اُس وقت کی مصیبت کو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اُس نے عجب لطف سے لکھا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

من کہ بر بستر نہ نہادم گُل	بار بر سر نہاد و گفتا چُل

(دریائے جہلم کے پار کے ملک میں چل بمعنی برو کی جگہ چُل کہتے ہیں)۔ فی الحقیقت بادشاہ کا مارا جانا اور قتل عام اور شہروں کی بربادی خلقت کی تباہی عجب قیامت کا وقت ہوگا۔ اکثر لوگوں نے نظم اور نثر میں مرثیے کہے۔ امیر خسرو نے بھی ترکیب بند

کے طور پر دو مرثیئے لکھے ہیں کہ جن کے دیکھنے سے اب تک بدن پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ دہلی میں جب یہ مرثیئے پہنچے تو مہینوں تک انہیں کوچہ و بازار میں لوگ پڑھتے تھے اور اپنے مردوں کے حال پر روتے تھے۔ یہ واقعہ سنہ ۶۸۴ ہجری میں ہوا۔ اسی شاہزادہ نے شیخ سعدی کو بھی بلایا تھا (دیکھو ذکر سعدی کا) اور خسرو کا یہ شعر بھی لکھ کر بھیجا تھا ؎

دو بادام سیہ ہر سو میفگن در نظر بازی ॥ نگہدارش کہ روزے بر سر تا یونم اندازی

غرضکہ وہ خسرو ملک کمال۔ شاہزادہ ناصر الدین محمود و التمش۔ غیاث الدین بلبن۔ معز الدین کیقباد۔ جلال الدین خلجی۔ علاؤ الدین خلجی۔ قطب الدین مبارک شاہ۔ تغلق کے دربار میں رہا اور ہر جگہ معزز رہا۔ ایک دفعہ تغلق اُسے اپنے ساتھ لکھنوتی تخت گاہ بنگال میں لے گیا جب وہاں سے پھر کر آیا تو سلطان نظام الدین کا انتقال ہو گیا تھا کپڑے پھاڑ ڈالے اور اُن کی قبر پر جا کر خوب رویا اور خاک پر لوٹا اور فقیر ہو کر وہیں بیٹھ رہا۔ آخر بعد چھ مہینے کے سنہ ۷۲۵ ہجری میں فوت ہوا۔ چونکہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے کہ سنہ ۶۹۶ ہجری میں عمر اُس کی ۴۵ برس کی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنہ ۶۵۱ ہجری میں ناصر الدین محمود کے عہد میں پیدا ہوا۔ اور ۷۴ برس کی عمر میں مرگیا۔ عدیم المثال اور طوطیِ شکر مقال تاریخ فوت اُسکی ہے۔ تذکرۂ دولت شاہی میں سنہ ۷۱۵ ہجری لکھتے ہیں اور یہ غلط ہے۔ سنہ ۸۹۷ ہجری عہد بابر میں مہدی خواجہ نام ایک شخص کہ بابر کا داماد تھا بلکہ پہلے پہلے وزیر مملکت کا بھی ارادہ تھا کہ بجائے ہمایوں کے اس کو تخت نشین کرے مگر جب اُسے معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ میرا ہی دشمن ہے تب اس ارادے سے باز رہا۔ غرض مہدی خواجہ نے قبر پر جالی دار دیواریں پتھر کی بنوائیں کہ اب تک موجود ہیں۔ اور بابر نے اشعار تاریخ وغیرہ کندہ کرائے۔ سنہ ۱۰۱۴ ہجری عہد جہانگیر میں طاہر بیگ نام کسی امیر نے اُس پر عمارت و گنبد سنگ مرمر کا بنوایا۔ مخفی نہ رہے کہ امیر خسرو

علم موسیقی میں مہارت کلّی رکھتے تھے۔ کئی رسالے اس فن میں اُن کی تصنیف سے ہیں۔ ترانہ انہیں کا ایجاد ہے۔ دکھن کی طرف سے ایک بڑا کلاونت آیا کہ تمام راجاؤں اور بادشاہوں کے گوّیوں سے سر دربار مباحثہ کر آیا تھا۔ جب دربار شاہ دہلی میں پہنچا۔ پہلے دن خسرو سامنے نہ آیا اور تخت کے نیچے چھپ کر اُس کا گانا سُنا۔ چونکہ راگ مذہب ہنود میں داخلِ عبادت ہے۔ اُس زمانہ تک دُھرپد اور خیال اور مضمون وحدانیت و معرفت کے راگ میں کہتے تھے ٹپہ ٹھُمری غزل واہیات عشق و محبّت کی بات اس میں نہ تھی۔ پس امیر خسرو نے دوسرے دن قول ایجاد کر کے گایا۔ اُس میں مضمون عشق الٰہی کا اور ایک ٹکڑا آیت یا حدیث کا بھی ہوتا ہے۔ چونکہ عشق کے نام کو تاثیر ہے اس واسطے خاص و عام کو پسند آیا۔ کلاونت نے از راہِ فخر ظاہر کیا کہ ہمارے راگ سے تم شاعروں کے کلام کی رونق اور تاثیر زیادہ ہوتی ہے اور بغیر راگ کے کلام ناتمام رہتا ہے۔ امیر خسرو نے کہا کہ اگر کلام ہمارا نہ ہو تو بے تلفظ کے تمہارا راگ بالکل چل نہیں سکتا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ کلام محتاج راگ کا نہیں اور برخلاف اس کے راگ محتاج کلام کا ہے۔

بہار کے موسم میں بسنت کا میلہ جو دہلی میں ہوتا ہے وہ بھی درحقیقت انہیں سے نکلا ہے۔ کہتے ہیں کہ سلطان نظام الدین اولیا کا ایک بھانجا تھا اُسے وہ بہت چاہتے تھے اتفاقاً مر گیا۔ اُس کا اُنہیں اس قدر رنج ہوا کہ گانا سُننا اور لطف خوشی کی ساری باتیں چھوڑ دیں۔ اس میں موسم بہار آیا۔ ایک دن امیر خسرو دربار کی برخاست کے بعد معمول کے بموجب ان کی طرف چلے۔ اُس دن ابر تھا۔ رستہ میں لالہ و گل کے چمن کھلے ہوئے کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک ایک پھول رنگ برنگ کا لینا شروع کیا کہ ایک گلدستہ بن گیا۔ اس میں جہاں اور سب پھول تھے ایک گچھا سرسوں کے پھولوں کا بھی تھا بلکہ ایک گیہوں کی بال بھی تھی۔ غرض اس کیفیت کے عالم میں کچھ گاتے ہوئے چلے۔ جب پاس پہنچے

تو اُنہیں بھی آواز گئی اور یہ اندر جا کر چپ ہو گئے۔ مگر وقت کا سماں ایسا بندھا تھا کہ اُنہیں یہ آواز سُن کر وجد کا عالم طاری ہوا اور خود فرمایا کہ خسرو کیا گا تا تھا۔ انہوں نے پھر شروع کر دیا اور اُس دن سے وہ جو بندش کی آن تھی ٹوٹ گئی۔ پھر لوگوں نے معمول باندھ لیا کہ جب بہار آتی تو ایک دن سب کلاونت اور گوّیئے جمع ہو کر مجرا کرتے تھے۔ بعد اس کے یہ میلا مقرر ہو گیا۔ اور بہار راگ کو بھی دیکھو تو جس طرح اُس گلدستہ میں گلہائے رنگا رنگ یہاں تک کہ سرسوں کے پھول اور گیہوں کی بال تک موجود تھی اسی طرح اس میں ہر وقت اور ہر موسم کے راگوں کے سُر موجود ہیں۔ چنانچہ وہ رسم اب تک چلی آتی ہے کہ دلی میں ہر برس جب بہار کی آمد ہوتی ہے تو سب کلاونت اور گوّیئے ڈوم پنچایت کر کے ایک دن مقرّر کرتے ہیں اور اس کی خاص و عام کو بھی خبر کر دیتے ہیں اُس دن سب بن سنور کر اپنے اپنے ساز و سامان لئے پھولوں کے گلدستے ہاتھوں میں اور شیرینی وغیرہ لے کر گاتے بجاتے ہوئے جس درگاہ پر جانے کا دن مقرّر ہوتا ہے وہاں جاتے ہیں۔ گلدستے شیرینی چڑھا دیتے ہیں۔ پہلے خود کلاونت ڈوم تھوڑی دیر تک کھڑے ہوئے گاتے ہیں پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعد انکے طوائف جو حاضر ہوتی ہیں وہ ناچتی گاتی ہیں۔ ہزاروں آدمیوں کا انبوہ ہو جاتا ہے۔ شام کو سب اپنے اپنے گھر چلے آتے ہیں۔ اگرچہ یہ میلا ڈوم ڈھاڑیوں نے مقرّر کیا ہے مگر اسکے دن بھی ایک سلسلہ سے مقرّر کئے ہیں۔ یعنے پہلے دن خدا کے ہاں بسنت جاتی ہے اور پہاڑوں پر بولی بھٹیاری کے محل ایک جا ہے مقرر تھی وہاں سب جاتے ہیں۔ دوسرے دن حضرت نبی کریم یعنے قدم شریف تیسرے دن حضرت شاہ مردان۔ چوتھے دن سلطان نظام الدین اولیا۔ بعد انکے اور مزار جو جو نامی گرامی تھے وہاں جاتے ہیں۔ اس کے لطائف ظرائف اگر لکھے جائیں تو ایک بڑی کتاب بنتی ہے۔

لطیفہ۔ ایک دن سلطان نظام الدین کے ہاں کوئی عقل کے ڈلی مہمان آئے بعد طعام رات کو بیٹھے اور باتیں شروع ہوئیں۔ امیر خسرو بھی دربار سے وہیں آ جاتے

تھے آکر شامل جلسہ ہوئے ۔ مہمان مذکور نے جوان با اخلاق مہماں نوازوں کو متوجہ دیکھا تو ایسا باتوں کا جھاڑ باندھا کہ تار کہیں ٹوٹتے ہی نہیں ۔ سلطان نظام الدّین بار بار تقریر کو خاتمہ پر لائے اور قصّہ مختصر کیا ۔ مگر وہ شخص مطلق نہ سمجھا ۔ رات بہت گئی دق ہو گئے انگڑائیاں بھی آئیں جمائیاں بھی دکھائیں پر اُس اللہ کے ولی نے ذرا خیال نہ کیا ۔ یہاں تک کہ آدھی رات کی نوبت بجنے لگی ۔ سلطان نظام الدّین نے امیر خسرو سے ہنسکر کہا کہ خسرو ! نوبت میں کیا آواز آتی ہے ۔ یہ بھی سمجھ گئے ۔ کہا پیر و مرشد ۔ یہی آواز آتی ہے :۔

نان کہ خوردی خانہ برو	نان کہ خوردی خانہ برو
نہ کہ بدستِ توکردم خانہ گرو	نان کہ خوردی خانہ برو

نقل ۔ ایک دن امیر خسرو شاہ نظام الدین اپنے مرشد کے ساتھ بازار میں چلے جاتے تھے ۔ دُھنیا روئی دُھنک رہا تھا ۔ انہوں نے پوچھا کہ خسرو ! یہ دُھنکی میں کیا کہتا ہے ۔ عرض کی حضرت یہی کہتا ہے :۔

درپئے جاناں جاں ہم رفت ۔ درپئے جاناں جاں ہم رفت
اینہم رفت واں ہم رفت ۔ رفت او رفت او رفتن دہ ۔
رفت او رفت او رفتن دہ ۔

نقل ۔ امیر خسرو جس محلّہ میں رہتے تھے وہاں بازار کے سرے پر ایک بھنگیڑن بیٹھتی تھی ۔ ان کے لئے بھی اکثر سر راہ حقہ لے کر کھڑی ہو جاتی تھی ۔ ایک دن اُس نے کہا کہ قربان جاؤں سب کے لئے شعر کہتے ہو میرے نام کا بھی تو کوئی شعر کہو ۔ انہوں نے کہا کہ اچھا کہدونگا ۔ وہ اسی طرح روز تقاضا کیا کرتی ۔ ایک دن ان کا گزر ہوا تو وہ حقہ لیکر دوڑی اور حقہ پلاتے میں پھر کہا ۔ انہوں نے کہا

اَوروں کی چوپہری باجے چمّو کی اٹھ پہری	[illegible]	باہر کا کوئی آتا ناہیں آتے ہیں سارے شہری
چھان چھون صاف کرے اور رکھے میں تو سل		اور وکی میں سینک سلائے چمّو کی میں موسل

لطیفہ۔ ایک دفعہ امیر خسرو سفر میں تھے۔ جنگل میں چلتے چلتے پیاس لگی۔ سامنے سے ایک گاؤں نظر آیا۔ اس میں چلے گئے۔ دیکھیں تو کوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی ہیں۔ اتفاقاً چاروں چھل باز اور ہنس مکھ تھیں پوچھا کہ میاں مسافر تمہارا نام کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خسرو۔ نام کے سنتے ہی سب اُچھل پڑیں کیونکہ ہندوستان میں ایسی عورت کون ہوگی جسے دو چار گیت خسرو کے یاد نہ ہوں۔ اب تک ”جو پیا آون کہہ گئے“ برسات کا گیت مشہور ہے۔ غرضکہ ایک ایک نے شعر کی فرمایش کی اور کہا کہ پہلے شعر سناؤ جبھی پانی پلائینگے۔ یہ مارے پیاس کے گھبرائے ہوئے تھے۔ ہر چند سمجھایا مگر اُن بلبلوں نے ایک نہ مانی۔ آخر ہر ایک سے پوچھا کہ کس کس مضمون کا شعر کہواتی ہو۔ ایک نے کہا کھیر کا۔ دوسری نے کہا چرخے کا۔ تیسری نے کہا کتے کا۔ چوتھی نے کہا۔ ڈھول کا۔ امیر خسرو نے اُسی وقت کہا اور ان کی ہی سمجھوں کے بموجب کیا خوب کہا کہ :۔

	کھیر پکائی جتن سے اور چرخا دیا جلا آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا	لاؤ پانی

غرض قول اور ترانے اور گیت ان کے بنائے ہوئے آج تک مشہور ہیں اور نظم شعر میں ایسے ایسے لطائف اور رنگینیاں نکالی ہیں کہ خاص و عام پسند کرتے ہیں رباعی

رفتم بتماشائے کنارِ جوئے گفتم صنما بہائے ہر موئے چیست	دیدم بلب آب زنِ ہندوئے فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے	

چیستانیں فارسی میں اور پہیلیاں اُردو میں ان کا ایجاد ہے۔ چیستان :۔

رنگش چو رنگ زعفراں پا دارد و پر ہم بداں	بریاں چو جانِ عاشقاں جاناں بگو ایں چیستاں	یعنی پاپڑ

پہیلی ہندی

بالا تھا تو سب کو بھایا	بڑا ہوا تو کام نہ آیا
میں نے دیا اُس کا ناؤں	بوجھو ارتھ یا چھاڑو گاؤں

دیگر

ساون بھادوں بہت بہی اور ماہ پوس میں تھوری
امیر خسرو یوں کہیں کہ بوجھ پہیلی موری

مکرنی خاص ایجاد ان کا ہے شرح اُس کی اس مثال سے واضح ہوگی۔ **مکرنی**

باٹ چلت مورا انچرا گہے	بہری سُنے نہ اپنی سکہے
اب موہے آسکے جھگڑا اجھانٹا	اے سکھی ساجن نا سکھی کانٹا

نصیحت

میانِ بخشش و اسراف ہست تفرقۂ	بگویم ار شنوی لیک از سرِ انصاف
اگر بطبع کرم مے کنی بدانکہ سخاست	دگر ز بہرِ نکو گفتنِ مرداں اسراف

گرت بگفتنِ بد جا ہلے کشاد زبانے	تو زاں حدیث بد و گفتِ بے فروغ چہ رنجی
گر آنچناں نئہ کو گویدت زراست چہ رنجش	وراں نئہ تو کہ او گفتہ از دروغ چہ رنجی

مرد را تا بلا و رنج ندید	بر بساطِ نشاط راہ نشد
تا نشد سفتہ گوہر از الماس	در خورِ تاجِ بادشاہ نشد

غزل

تاجدارانے کہ فتح قلعۂ دیں کردہ اند	التماسِ ہمت از دلہائے مسکیں کردہ اند
پاک بازانِ سر کوئے خراباتِ فنا	در مقامِ سرفرازی سنگ بالیں کردہ اند
جلوۂ فرہاد بیں کز غیرتِ آں خسرواں	نام خود نقش نگین لعلِ شیریں کردہ اند
آہوئے چیں را جگر در نافۂ سودا بسوخت	تا حدیثِ سنبلِ زلفِ تو در چیں کردہ اند

زاہداں تسبیح میگویند خسرو نام دوست
ذکر ہر کس آنچناں باشد کہ تلقیں کردہ اند

مولانا شہاب الدین معمائی نے اس کی تاریخ کہی اور خود کھدوا کر لگائی ؎

میر خسرو خسرو ملک سخن — آں محیط فضل و دریائے کمال
نثر او دلکش تر از ماء معین — نظم او صافی تر از آب زلال
بلبل دستاں سرائے بے قرین — طوطی شکر مقال بے مثال
از پئے تاریخ سال فوت او — چوں نہادم سر بزانوئے خیال

شد عدیم المثل یک تاریخ آں
دیگرے شد طوطی شکر مقال

بداؤنی کہتا ہے کہ امیر خسرو کا بیٹا بھی شاعر ہوا۔ مگر دیوان دیکھنے میں نہیں آیا۔ سنتے ہیں کہ ۹ ۱۰ ہزار شعر کا دیوان ہے۔ بلکہ کچھ شعر زبانی بھی سننے میں نہیں آئے۔ البتہ ظہیر کے شعروں پر جو اعتراض کئے اور اصلاحیں دی ہیں وہ مشہور ہیں۔ سچ ہے صاحب کمال کا بیٹا صاحب کمال نہیں ہوتا۔

نور الدین عبد الرحمن جامی عرف مولوی جامی

اصلی نام عماد الدین اور نسب خاندانی امام محمدؒ شاگرد امام ابوحنیفہؒ سے ملتا ہے۔ ۲۶ شعبان ۸۱۷ھ ہجری میں موضع جرمرد علاقہ جام میں پیدا ہوئے اس واسطے جامی تخلص کیا اور ہرات میں پرورش پائی۔ ابتدائے سن میں تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور اس زمانہ کے علوم مروجہ میں کامل ہوئے۔ شاعری کا شوق کیا اور زور علم سے اُسے بھی انتہا کو پہنچایا۔ قصیدہ و مثنوی و رباعی و غزل وغیرہ

نظم و نثر سب طرح کا کلام ان کا موجود ہے ۔ جب فقیری پر مائل ہوئے ۔ شیخ سعدالدین کاشغری کے مرید ہوئے ۔ ریاضت و عبادت سخت اختیار کی ۔ زہد و پرہیزگاری نیک اخلاقی و خوش اطواری سے عظمت اور کرامت حاصل کی ۔ حج کو گئے ۔ اور آداب الحرمین اُس حال میں تصنیف کی ۔ کلام ان کا اکثر مقبول خلایق ہوا چنانچہ یوسف زلیخا سے ظاہر ہے ۔ ناظم ہروی ایک شاعر نامی نے بھی ایک زلیخا لکھی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی کتاب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے لیکن یہ خدا کی قدرت کہ اس نے رواج پایا اُس کی کتاب کو کوئی جانتا بھی نہیں ۔ مگر بہ نسبت یہاں کے ترکستان میں اُس کا رواج زیادہ ہے ۔ سلطان حسین بایقرا اور سلطان ابوسعید گورگانی کا عہد سلطنت انہوں نے پایا اور ہمیشہ شاہ اور شاہزادوں کی مجلسوں میں عزّت و احترام سے طلب ہوتے تھے ؛

فوائد ضیائیہ یعنے شرح ملّا علم نحو میں نہایت مشہور اور مروّج کتاب ہے ؛ فن معمّا میں ان کے برابر کوئی صاحب کمال نہیں ہوا چنانچہ اُس میں بھی چند رسالے موجود ہیں ۔ آیہ یا حدیث یا عربی فقروں کو اپنے فارسی شعروں میں بہت فصاحت سے تضمین کرتے ہیں ؎

شد برقع روئے چو مہت زلف شب آسا	سبحان قدیراً جعل اللیل لباسا

دیگر

کس بیک جاندید ظلّ و ہما	جز دو زلف تو دام ظلّہما

اور اشعار آیندہ سے مفصّل معلوم ہوگا ۔ اُن کے تین دیوان ہیں :۔

اوّل ۔ فاتحۃ الشباب ۔ جس میں ۲۷۰ صفحہ غزلیں ۔ ۹۰ صفحہ قصاید اور ۷۰ رباعیاں اور کچھ ترجیع بند ہیں ۔ سر دیوان پر جو دیباچہ ہے ابتدا اُس کی یہ ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	اعظم اسماے علیم و حکیم

۲۔ واسطۃ العقد کی ۱۰ ہزار بیت جن میں قریب ۷۰ آکے رباعیات اور کچھ ترجیع بند۔ اُس وقت ۷۰ برس کی عمر تھی اور یہ ۸۸۴ھ میں مرتب ہوا۔

۳۔ خاتمۃ الحیوٰۃ۔ ۱۳۴ صفحہ ۱۹ سطر۔ آخر میں کچھ رباعیاں۔ یہ ۸۹۶ھ میں ترتیب ہوا۔

خمسۂ نظامی پر سبحۃ الاحرار زلیخا لیلی مجنوں تحفۃ الاحرار خرد نامۂ اسکندری کو یکجا کر کے خمسہ لکھا۔ سلسلۃ الذہب حدیقۂ سنائی کے جواب میں اور سلیمان وابسال کو اُن پر زیادہ کر کے ہفت اورنگ نام رکھا۔ شاعر مذکور اپنی ہر ایک کتاب منظوم کے بلکہ دیوان کے اول میں بھی دیباچہ نثر کا ضرور لکھتا ہے۔ گلستان پر بہارستان لکھی۔ عبارت فصیح اور مضامین عالی ہیں۔ لیکن اس عالم متبحر کے نظم سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زورِ علم اور چیز ہے اور طبیعتِ خدا داد اور چیز ہے۔ نفحات الانس صوفیانِ بزرگ کے احوال میں ایک تاریخ مفصّل لکھی ہے۔ غرض اسی طرح نفحات الانس۔ نقد الفصوص۔ اشعۃ اللمعات شرح فصوص الحکم۔ شرح ملا۔ رسالہ عروض۔ شرح قصیدہ ابن فارض۔ شرح بیت امیر خسرو۔ ترجمہ چہل حدیث۔ شواہد النبوۃ۔ مناقب مولوی خواجہ انصار۔ شرح رسالہ مناسک حج۔ فتوح الحرمین۔ آداب الحرمین جو حالت حج اور زیارت مدینہ میں لکھی۔ نظم اس رسالہ کی فصیح و بلیغ ہے۔ اُس میں دونو مقاموں کے حالات تاریخی ضمناً بیان کئے ہیں۔ رسالہ عروض۔ رسالۂ قافیہ۔ رسالہ موسیقی۔ رسالہ معمّے مسمّے بہ کبیر و متوسط و صغیر۔ رسالہ منظومہ و اصغر در معمّے۔ منشآت و مکاتبات۔ نقد النفوص۔ رسالہ طریق صوفیان۔ شرح رباعیات۔ شرح بیتین از مثنوی مولوی روم۔ لوائح۔ شرح حدیث ابی ذر عقیلی۔ سخنان خواجہ پارسا۔ رسالہ تحقیق مذہبِ صوفی و متکلم و حکیم۔ رسالہ فی تحقیق الوجود۔ رسالہ سوال و جواب ہندوستان۔ رسالہ لا الہ الا اللہ۔ شرح بعضے از مفتاح الغیب منثور و منظوم۔ تفسیر ناتمام۔ رسالہ صرف و منطق۔ حلیۃ الحلل۔ شرح قصیدہ بردہ منظوم

وغیرہ ۹۹ کتاب ان کی تصنیفات ہے۔ نصائح اور تہذیب اخلاق ان کے تصوّف اور اکثر حدیث کے پیرایہ میں ہوتے ہیں۔ ان کی کثرت تصانیف کو دیکھکر خیال آتا ہے کہ کیا نیّتِ نیک اور قابل مادّہ تھا کہ جس پر اثر علم کا پورا ہوا۔ تمام عمر تصنیف اور تالیف میں مصروف رہے۔ کمال سے اصل مقصد یہی سمجھا کہ خیر خواہیِ خلایق اور نام نیک حاصل ہو۔ نہ حرص و طمع غالب ہوئی نہ طبیعتِ عالی دنیا کے منصبوں کی طالب ہوئی۔ باوجود اس علم و کمال کے اور خوبیِ حال و مقال کے خوش طبع بھی تھے۔ ساغری تخلّص ایک شخص ایک شاعر اِن کے زمانہ میں تھا اور کہتا تھا کہ سب شاعر میرے مضمون چُرا چُرا کر باندھتے ہیں۔ یہ سُن کر مولوی جامی نے بھی یہ کہا۔ قطعہ:

ساغری میگفت دزدانِ معانی بردہ اند — ہر کجا در شعرِ من یک معنیٔ خوش دیدہ اند
دیدم اکثر شعرہایش را یکے معنی نداشت — راست میگفت اینکہ معنی ہاش را دزدیدہ اند

ساغری نے یہ سُن کر ان سے شکایت کی کہ آپ میرے شعروں کو بے معنی کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو ایک شاعر کی حکایت بیان کی ہے۔ کسی نے غلطی سے تمہارے سامنے شاعر کو ساغر پڑھ دیا ہوگا۔ اس قسم کے لطایف و ظرایف ان کے بہت ہیں۔ امیر خسرو کا ایک شعر ہے ؎

گر مہ شود بڑا و ستارہ شود بڑی — با خوانِ نعمتِ تو کند کے برابری

چونکہ بڑا اور بڑی ہندوستان کے کھانوں میں سے ہیں۔ جب یہ شعر وہاں پہنچا تو جامی نے جانا کہ یہ کوئی معمّا ہے اس کی شرح میں ۹ جز کا رسالہ لکھا۔ بہت سی صورتیں قیاسی اور معانی وہی لکھے ہیں کہ جن کے دیکھنے سے تعجب آتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح سے غیر زبان میں جب ہم مداخلت کرتے ہونگے تو اصل زبان دانوں کے آگے ٹھوکریں کھاتے ہونگے لیکن بعد تمام تقریرات کے لکھا ہے کہ عجب نہیں ہندوستان میں شاید بڑا بڑی کسی کھانے کا نام بھی ہو۔ اس جگہ سے رسائیِ ذہن اور سلامتیِ طبع مصنّف کی معلوم ہو سکتی ہے۔ غرض سلطان ابوسعید اور شاہ سلطان حسین

کا زمانۂ سلطنت عزّت اور قدر و منزلت سے بسر کیا آخر ۸۱ برس کی عمر میں فوت ہوئے کاس کے عدد سے اُن کی عمر کے برس معلوم ہوتے ہیں کہ زبان عربی میں بمعنی جام ہے ۔ ہجدہم روز ماہ عاشورہ (۸۹۸ھ) ۔ اور ۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۸۹۸ھ) تاریخ وفات ہے ۔ چند اشعار اُن کے نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں :۔

حمد

اے صفاتت تو نہاں در تتق وحدت ذات
جلوہ گر ذات تو در پردۂ اسماء و صفات

ما گرفتار جہات از تو نشاں چوں یابیم
اے سراپردۂ اجلال تو بیروں ز جہات

اے ندائے تو درافتاد و صدائے بحرم
خاست صد نعرۂ لبّیک ز اہل عرفات

مشرب عشق کجا چاشنئ درد کجا
آں یکے تلخ اُجاج آمدہ وایں عذب فرات

مُرد جامی بسر تربت او بنویسند
ھذہ مرقد من حل بہ العشق فمات

بکعبہ رفتم و زانجا ہوائے کوے تو کردم
جمال کعبہ تماشا بیاد روے تو کردم

شعار کعبہ چو دیدم سیاہ دست تمنّا
دراز جانب شعر سیاہ موے تو کردم

چو حلقۂ در کعبہ بصد نیاز گرفتم
دُعاے حلقۂ گیسوے مشکبوے تو کردم

نہادہ خلق حرم سوے کعبہ روے ارادت
من از میانہ ہمہ روے دل بسوے تو کردم

فتادہ اہل منا در پئے مُنا و مقاصد
چو جامی از ہمہ فارغ من آرزوے تو کردم

عُرفیؔ شیرازی

نام اس شاعر رنگین کا محمد جمال الدین اور وطن شیراز تھا۔ آغاز شباب میں ہندوستان ملک دکن میں آیا۔ وہاں کامیاب نہ ہوا اس واسطے آگرہ میں آکر حکیم ابوالفتح گیلانی رکن دربار اکبری سے ملا۔ وہ صاحب نظر جوہر قابل دیکھ کر رعایت و سلوک سے پیش آیا۔ اُس کی تعریف میں عرفی نے قصاید و اشعار کہہ کر شہرت حاصل کی۔ جب وہ مرگیا تو عبدالرحیم خانخاناں سپہ سالار اکبر کی قدردانی سے فارغ البال رہا۔ اُس کی تعریف میں جو ساقی نامہ اور قصائد غرّا لکھے اُس سے زیادہ تر شہرت ہوئی۔ بادشاہ کے دربار میں طلب ہوا۔ لیکن ابوالفضل اور فیضی دربار شاہی کے ایسے دخیل تھے کہ کسی صاحب کمال کا گزارہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس واسطے خاطر خواہ رشد نہ پا سکا۔ وہ سر دربار اس پر طعن و تعریضیں کرتے تھے۔ اور یہ بھی ایسے جواب ہائے دنداں شکن دیتا تھا کہ تمام اہل دربار محظوظ ہوتے تھے۔ چونکہ مذہب اُس کا شیعہ تھا پہلے دن جب باریاب دربار ہوا۔ ایک بھائی نے پوچھا کہ آغا در مذہب شما سگ حلال است۔ عرفی نے عمداً ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے بھائی نے پھر پوچھا کہ در مذہب شما زاغ حلال است۔ اُس نے پھر کچھ جواب نہ دیا۔ چونکہ اکبر بھی ان کی بُلفضولیوں کو پسند کرتا تھا۔ اُس نے خود کہا کہ سوال اینہا را جواب ندادید۔ اُس نے کہا قبلۂ عالم چہ عرض کنم حاجت جواب نیست ظاہر است کہ ہر دو گوہ میخورند۔ ایک دن عرفی فیضی کی ملاقات کو گیا۔ فیضی کو کتوں کا بہت شوق تھا اور ہر وقت چند کتّے اُس کے گرد پیش بیٹھے رہتے تھے۔ جیسے کہ رسم ہندوستان کی ہے۔ اُس نے پیار سے ایک کتّے کو بیٹا کر کے

خطاب کیا۔ عرفی نے کہا کہ ایں صاحب زادہ چہ نام دارد۔ فیضی نے کہا کہ برائے سگ نام چہ باشد خود عرفی است۔ عرفی نے ہنس کر کہا مبارک باشد۔ کیونکہ شیخ مبارک باپ فیضی کا تھا۔ غرض کہ دیوان غزلیات اس کا مختصر اور کم مشہور ہے۔ دیوان قصاید تحصیل زبان فارسی کے لئے داخلِ تعلیم ہے اور خاص و عام میں مشہور ہے۔ بعضے قصاید مثل ترجمۃ الشوق وغیرہ ایسے عالی درجہ پر واقع ہوئے ہیں کہ ظہوری وغیرہ اکثر شعرائے نامی نے اُن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن نہیں پہنچ سکے۔ شاہزادہ سلیم یعنی جہانگیر سے بہت محبت رکھتا تھا۔ ایک قصیدہ جو اکبر کی تعریف میں کہا ہے اُس میں بھی اُس کی تعریف پر رجوع کی ہے۔ آخر حاسدوں نے اُسے زہر دلوادیا۔ لشکر شاہی کے ساتھ پیشاور کے قریب ۹۹۹ھ ہجری میں ۲۴ یا ۲۵ برس کی عمر میں مرض اسہال سے وفات پائی۔ فیضی جس وقت کہ عیادت کو گیا وقت اخیر یعنی قریب الموت تھا۔ پس اس نظر سے کہ دیکھے ہوش و حواس عرفی کے قائم ہیں یا نہیں اُس سے پوچھا کہ ماکیانیم یعنی تم پہچانتے ہو ہم کون ہیں۔ عرفی نے اُسی وقت مسکرا کر کہا کہ حالا مرغِ روحم شوقِ پرواز دارد رُو بہ ماکیان نمے آرد ۔

تاریخ

اکثر اہلِ تاریخ کہتے ہیں کہ عرفی خود پسند اور دعوے کمال کا بہت ظاہر کرتا تھا یہی سبب ہوا کہ جیسا کمال تھا ویسا مرتبہ نہ پایا۔ اور ابوالفضل بھی آئین اکبری میں شعرا کے ذکر میں اس کا اشارہ کرتا ہے ۔

اُس کی تصنیف کے باب میں ایک امر واجب الاظہار ہے کہ اہل ہند اُس کے نہایت مدّاح و ثناخواں ہیں اور قصاید اُس کے درس میں داخل ہیں لیکن اہل ولایت سے جو تحقیق کیا گیا تو اُنہوں نے بیان کیا کہ اس میں شک نہیں کہ کلام اُس کا رنگین ہے اور استعارات باریک ہیں۔ لیکن قصیدہ میں یہ طرز جو اُس نے اختیار کی ہے خلاف اصول ہے۔ اس میں پیروی خاقانی و انوری کی لازم ہے۔

یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرفی اُس سے عاجز تھا۔ لیکن اُس نے ہند میں آکر اہلِ ہند کی طبیعت کو اس طرف راغب دیکھا اس واسطے یہی طرز اختیار کی۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام قصاید میں دو قصیدے اس کے خوب ہیں۔ اوّل قصیدۂ ترجمۃ الشوق جسکا مطلع ہے ؎

جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار   نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

اور دوسرے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

ایں بارگاہ کیست کہ گویند بے ہراس   کاے اوج عرش سطح حضیض تو اساس

صاحب آتش کدہ صاف اُس کے کلام کو بُرا کہتا ہے اور ناپسند کرتا ہے۔ اور اس پر سنداً چند شعر مثنوی کے درج کئے ہیں ؛

سعید قریش نے اس قصیدہ کا جواب بطریقِ طعن کے لکھا ہے اور سلسلۂ سخن کو ہزل میں ڈال دیا ہے چنانچہ اُس کا مطلع ہے ؎

ز مفلسی چو نباشد بدست یک دینار   چہ سود اگر بفروشند بخت در بازار

یہ صاف اثر حسد اور رشک کا ہے ؛

چونکہ قصاید اُس کے خاص و عام میں حد سے زیادہ مشہور ہیں اس واسطے ایک رباعی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ رباعی :-

عرفی دمِ نزع است و ہماں مستیٔ تو   آخر بچہ مایہ بار بر بستیٔ تو
فرداست کہ دوست نقدِ فردوس بکف   جویائے متاع است و تہیدستیٔ تو

قصیدۂ ترجمۃ الشوق میں اُس نے اپنے حسن اعتقاد سے کہا تھا ؎

بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم   اگر بہ ہند ہلاکم کنی و گر بہ تتار

جب مر گیا تو لاہور میں مدفون ہوا۔ ایک شخص کا باپ عرفی کے پہلو میں مدفون تھا وہ اُس کے دھوکے میں عرفی کے استخوان بوسیدہ نکال کر نجف اشرف کو لے گیا۔ رونقی شاعر نے شعر مذکورۂ بالا سے وہاں تاریخ نکالی ؎

رقم زد از پئے تاریخ رونقی کلکم   بکاوشِ مژہ از گور تا نجف آمد

اور اُس کے دشمنوں نے اشعث طاّع تاریخ نکالی ہے۔ اُس کی غزلوں کے اشعار کے لکھنے کو دفتر چاہیئے ہے مگر ایک شعر جسے سرخوش کہتا ہے کہ میاں ناصر کو عرفی کا یہی شعر پسند تھا وہ بھی درج ہوتا ہے ؎

من ازیں دردِ گراں مایہ چہ لذت یابم	کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

ملک الشعرا ابوالفیض فیضی فیاضی

یہ صاحب کمال ابوالفضل کا بڑا بھائی تھا۔ ۹۵۴ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ علوم عقلی و نقلی میں مرتبۂ اعلےٰ کو پہنچا۔ بارہ ۱۲ ہزار کتاب اُس کے کتب خانہ میں موجود تھی۔ سالہا سال تک برہمن بن کر کاشی میں علم شاستری حاصل کیا۔ جب استاد پر حال کھل تو اُس نے نصیحت کی کہ گائتری منتر اور چار بید کا فارسی میں ترجمہ نہ کرے۔ چنانچہ فیضی نے اُس پر عمل کیا۔ اگرچہ ہر علم میں دستگاہ کامل تھی۔ لیکن زبان عربی اور علم حکمت کا بہت شوق تھا۔ ۲۹ جلوسی میں سواطع الالہام تفسیر قرآن تمام و کمال بے نقط لکھی۔ میر حیدر معمائی نے تاریخ اُس کی سورۂ قل ہو اللہ سے نکالی اور دس ہزار روپیہ انعام ملے۔ علم اخلاق میں بزبان عربی ایک کتاب موارد الکلم لکھی وہ بھی بے نقط ہے۔ مہابھارت اور بھاگوت تاریخ معتبرہ ہنود اور لیلاوتی حساب کا ترجمہ کیا۔ لیلاوتی کے اوّل میں جو رباعی لکھی چونکہ طرز جدید ہے لہذا شعر اول لکھا جاتا ہے ؎

اوّل ز ثنائے بادشاہی گوئیم	وانگہ ز ستایش الٰہی گوئیم
ایں عقدۂ سربستہ زہم بکشائیم	ایں نکتۂ برجستہ کماہی گوئیم

با وجود اس علم و فضیلت کے نہایت طبع رنگین اور فکر موزوں رکھتا تھا کہ نہ

اُس وقت میں ایسا شاعر بے مثل تھا نہ آج تک ایسا جامع الکمالات پیدا ہوا طبیعت اُس کی شگفتگی میں بے مثل تھی ہمیشہ حاضر اور ہر وقت شگفتہ خاطر۔ شعر اُس کا نہایت صاف اور فصیح ہوتا ہے۔ فیضی کو اوّل روز جب اکبر کے سامنے لائے۔ بادشاہ جس جگہ بیٹھا تھا گرد کٹہرا جالیدار چاندی کا تھا۔ فیضی کو باہر کھڑا کیا۔ اُس نے فی البدیہہ یہ قطعہ پڑھا ؎

پادشاہا درون پنجرہ ام — از سر لطف خود مرا جا دہ
زانکہ من طوطیِ شکر خایم — جاے طوطی درون پنجرہ بہ

بادشاہ کو یہ اشعار برمحل اُس کے پسند آئے۔ روز بروز ترقی ہونے لگی ۔ سلاطین تیموریہ میں عہد اکبر میں اوّل غزالی مشہدی کو خطاب ملک الشعرائی ملا۔ مگر جب وہ مر گیا تو ۳۳ جلوسی میں فیضی ملک الشعرا ہوا۔ آخر عمر میں فیاضی[لہ] تخلص کرتا تھا۔ اُس کی قوّتِ حافظہ اور ذہن کے باب میں لوگ ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں کہ عقل میں نہیں آتیں۔ جو شاعر کوئی قصیدہ یا کتاب تصنیف کرکے دربارِ شاہی میں سناتا فیضی اُسی وقت کہتا تھا کہ اس شخص نے سرقہ کیا ہے یہ تصنیف میری ہے اور اکثر اشعار اور مقامات اُس کے ایک دفعہ کے سننے میں حفظ پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ بسبب ان کے کمال ذاتی کے اور تقرّبِ شاہی کے کوئی عالم فاضل شاعر دربار میں ٹھیر نہیں سکتا تھا۔ ابوالفضل کے ساتھ فیضی کی طبعِ حکمت پسند کو بھی پابندی مذہب کی گوارا نہ تھی۔ البتہ دنیا کی مصلحت سے دونو بھائی جو مناسب وقت دیکھتے تھے سو کہہ دیتے تھے اور ساتھ اپنے اکبر کو بھی سرگردان کرتے تھے۔ چنانچہ جب علماے نصارا ممالک فرنگ سے آئے تو انجیل اور توریت کا ترجمہ بایماے اکبر شروع کیا مصرع اوّل اسکے آغاز کا ابوالفضل نے یہ کہا ؎ | اے نامے تو ژزژ[لہ] و کرسٹو | فیضی نے

لہ بداؤنی طعن سے کہتا ہے کہ اس تخلص کا اختیار کرنا مبارک نہ ہوا کیونکہ دوسرے ہی مہینے مر گیا ۔

فی البدیہہ یہ کہا:- سُبحانکَ لاشریکَ لاھُوَ

ایک جگہ اپنے قصیدے میں کہتا ہے ؎

قسمت نگر کہ در خور ہر جوہرے عطا ست — آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او مے کند معائنہ خود در آئینہ — ایں مے کند مشاہدۂ حق در آفتاب

رباعی

نوریکہ ز مہر عالم آرا پیدا ست — از جبہۂ شاہنشہ والا پیدا ست
اکبر کہ بآفتاب دارد نسبت — ایں نکتہ ز بیّناتِ اسما پیدا ست

اس کے علاوہ جہاں اکبر کی تعریف کرتا ہے پیغمبر سے بھی بالاتر لے جاتا ہے چنانچہ اشعار اکبرنامہ منظومہ ناتمام و دیگر تصنیفات سے ظاہر ہے۔ ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

شکرِ ایزد راکہ مدّاحِ شہ بحر و برم — شاعرِ خاصِ جلال الدین محمد اکبرم
بود اگر در ہند خسرو طوطیِ شکر شکن — حالیا من در سخن گوئی از و شیریں ترم
او اگر پروردہ لطفِ محمد شاہ بود — من بمداحیِ اکبر شاہ جاں می پرورم
بود اکبر را محمد بندۂ فرماں پذیر — گر دریں موئے دروغے گفتہ باشم کافرم

کشمیر کے قلعہ کے دروازے پر جو تاریخ قلعہ کی کندہ ہے اس کا پہلا شعر ہے ؎

شہ شاہانِ عالم شاہ اکبر — تعالیٰ شانُہٗ اللہُ اَکبر

اہلِ دربار میں بجائے سلام علیک اللہ اکبر اور بجائے علیکم السلام جل جلالہٗ قرار پایا تھا۔ اس میں لطیفہ یہ تھا کہ نام بادشاہ کا جلال الدین اکبر شاہ تھا۔ بعض روپیوں میں بجائے سکہ کے دونو طرف یہی مسکوک ہے۔ ابوالفضل اپنی ہر تصنیف کے عنوان پر بجائے بسم اللہ کے اللہ اکبر لکھتا تھا۔ ان لغویات کی اگر تفصیل لکھی جائے تو انتہا نہیں۔ عبدالقادر بداؤنی (مسلمان عالم دیندار مترجم اور مولف اکبر شاہی تھا) نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں بہت کچھ

لکھا ہے اور اس پر کہتا ہے کہ ان لوگوں کی بے دینی اور بد مذہبی کا حال میں لکھ نہیں سکتا۔ اس کے نظم کو کہتا ہے کہ الفاظ کی استخوان بندی اچھی ہے۔ درد اور اثر سے خالی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کی حسن لیاقت اور ترقی اقبال کا رشک لوگوں کو جلاتا تھا اور بہانہ سے بُرا کہواتا تھا۔ ورنہ وہ زمانہ اس قسم کا تھا کہ لوگ عجیب و غریب حرکتیں کرتے تھے۔ قاضی خاں بدخشی قاضی القضاۃ نے سجدہ بادشاہ کے لئے نکالا اور اس کا جائز ہونا ثابت کیا۔ اور ملا عالم کابلی ہمیشہ اس امر کی حسرت ظاہر کیا کرتا تھا کہ کاش یہ مضمون مجھے سوجھتا۔ علیٰ ہذا القیاس سینکڑوں باتیں ہیں کہ جن کی تفصیل کو دفتر درکار ہیں۔ پھر ان غریبوں سے اتنی سخت گیری سے کیا حاصل۔ فیضی کی ایک انشاے مختصر دیکھی گئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت شاہزادوں کی بھی اس کے سپرد رہی تھی اور خاتمۂ مرکز ادوار سے بھی (جو کہ ابوالفضل نے لکھا ہے) یہ اشارہ پایا جاتا ہے۔ بموجب حکم بادشاہ کے خمسۂ نظامی پر خمسہ لکھنا شروع کیا۔ مخزن اسرار پر۔ مرکز ادوار۔ شیریں خسرو پر۔ بلقیس سلیمان۔ لیلیٰ مجنوں پر۔ نلدمن۔ ہفت پیکر پر۔ ہفت کشور۔ سکندر نامہ پر۔ اکبر نامہ۔ قرار پایا۔ ۹۹۱ھ ہجری میں حسب الحکم لاہور میں حاضر ہوا۔ پہلے نلدمن کو تمام کیا۔ یہ کتاب نزاکتِ مضامین اور فصاحت کلام میں بے مثل ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ راجہ بکرماجیت کے زمانہ میں کالیداس نام ایک شاعر ہوا ہے۔ اگرچہ بے علم تھا لیکن نہایت فصیح تھا۔ اُس نے نو کتابیں بطور افسانہ نظم میں لکھی ہیں۔ ایک اُن میں سے نل دونتی ہے۔ اگرچہ فیضی صاف نہیں کہتا کہ اُسی کا ترجمہ میں نے کیا۔ لیکن بعض مقاموں میں سے اشارہ پایا جاتا ہے نلدمن اور مرکز ادوار تمام و کمال رائج ہے باقی ناتمام رہیں۔ چند جزو اکبر نامہ کے بھی دیکھے گئے۔ نہایت پاکیزہ کلام ہے۔ چنانچہ جب اکبر نے آگرہ سے احمد آباد گجرات پر یلغار کی ہے اُس مقام کے دو شعر زبانی یاد ہیں بطریق نمونہ کے لکھے

جاتے ہیں ؎

بیک ہفتہ تا احمد آباد رفت	تو گوئی کہ بر مرکب باد رفت
یلاں بر شتر ترکش اندر کمر	شتر چوں شترمرغ در زیر پر

بیماری ضیق النفس سے جب فیضی قریب الموت ہوا تو بادشاہ مع شاہزادوں کے خود عیادت کو آیا۔ اُس وقت فیضی نے یہ رباعی پڑھی۔ رباعی

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد	مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درو مے گنجید	تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

۱۰ صفر ۱۰۰۴ ہجری میں بعمر پنجاہ سالہ فیضی مرگیا +

عبدالقادر بدائونی منتخب التواریخ میں لکھتا ہے کہ فیضی چھ مہینے تک بیمار رہا۔ امراض متضادہ میں مبتلا ہو گیا تھا ضیق النفس۔ استسقا۔ ورم دست و پا خون کا استفراغ۔ جس وقت مرنے لگا تو آدھی رات کا وقت تھا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ اُسی وقت آیا۔ اُس کا سر گود میں لے کر بیٹھا اور تین دفعہ پکارا کہ شیخ جی شیخ جی ہم حکیم علی کو لے کر آئے ہیں بات کیوں نہیں کرتے۔ کچھ جواب نہ دیا۔ بہت پکارا اور بیقرار ہو کر دستار زمین پر پھینک دی۔ مگر وہ آپ میں کہاں تھا کہ جواب دیتا۔ آخر بادشاہ ابوالفضل کو تسلی دے کر گیا اور فیضی مرگیا۔ یہ رباعی حقیقت میں اُسی کے حسب حال ہے۔ رباعی

افسوس کہ گلرخاں کفن پوش شدند	وز خاطر ہمہ گر فراموش شدند
آنانکہ بصد زباں سخن مے گفتند	آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

مرکز ادوار ابوالفضل نے اُس کے کلام کو ترتیب دینا چاہا۔ معلوم ہوا کہ اُس عالی دماغ نے پچاس ہزار شعر اپنے خود ناپسند کر کے دریا بُرد کر دیئے باقی جو کچھ دستیاب ہوئے۔

ماجب کلیات غزلیات و قصاید ۲۰ ہزار شعر ہیں۔ مجموعۂ نظم و نثر قصاید و غزلیات پچاس ہزار بیت شمار میں آئے۔ مرکز ادوار کے مسودات پریشان اُنہیں کاغذات

میں سے نکلے جو کہ بیماری میں اُس کے زیر دست رہتے تھے۔ ابو الفضل نے اُسے مرتب کیا ہے۔ تاثیر سخن و کیفیت کلام اور مضامین دنیا و فنائے دنیا و دل و روح و قلم و علم و فکر و تمیز وغیرہ کے باب میں خیالات نہایت لطیف اور دلچسپ موزوں کئے ہیں۔ فی الحقیقۃ مخزن اسرار کا جواب باصواب ہے۔ اکبر نے اُس کا نام مرات القلوب رکھا تھا۔ باقی تین کتابیں مذکورۂ بالا ناتمام رہیں۔ قصاید اُس کے اعلےٰ پایۂ بلاغت پر ہیں۔ غزلیات وغیرہ اول درجۂ فصاحت پر نہایت صاف اور عام فہم۔ دیوان مروج ۱۵ ہزار بیت کا ہے۔ چند حکایتیں کتاب گلستان و بوستان پر لکھی تھیں مگر ناتمام رہیں۔ بعض اشعار بطریق مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں:-

غزل

تا چند دل بعشوۂ خوباں گرو کنم
این دل بسوزم و دلِ دیگر ز نو کنم

سر بر نزد ز باغِ وجودم گلِ نشاط
تا کے ہوس بکارم و حسرت درو کنم

فیضی کفم تہی ورہ عاشقی بہ پیش
دیوانِ خود مگر بدو عالم گرو کنم

بودہ گر این چنیں سیہ چشم تو بر ہلاکِ ما
از پسِ مرگِ عاشقاں سرمہ کنند خاکِ ما

غزل

ساقیِٔ جاں خیز کہ شد صبحِ عید
صبحک اللہ بصبحٍ جدید

رقص کناں کعبہ بہ پہلوئے من
از چہ کنم بیہدہ منزل بعید

جانِ من و سلسلۂ زلفِ تو
عُلِّقَتِ الرُّوحُ بِحَبْلِ الْوَرِید

چشمِ تو بس کردہ ز خونریزِ خلق
غمزہ بغمزہ یاد کہ ہَلْ مِنْ مَزِید

گر تو نداری سرِ قربانِ من
بسکنم از دستِ تو خود را شہید

بردمِ تیغِ تو قضا کردہ نقش
اَنْتَ حَدِیدٌ لَکَ بَاسٌ شَدِید

فیضیٔ آزادہ اسیرِ تو شد
اَسعَدکَ اللہ بعبدٍ سَعِید

چیستانِ فیضی

چیست آں دُرجِ زمرّد رنگ ناپیدا دہاں	چوں صدف یکتا دُرِ ناسفتہ دارد درمیاں
حیرتے دارم کہ چوں آں درج بشگافد کسے	افگند آں گوہرِ ناسفتہ از کف رائگاں
مبدعِ صورت چو ترکیبِ وجودش نقش بست	پوستش بر مُو پدید آورد و مُو بر استخواں

ابو الفضل ابنِ شیخ مبارک

ابو الفضل اگرچہ فیضی سے عمر میں چھوٹا تھا۔ لیکن اقبال اور لیاقت میں اپنے بڑے بھائی بلکہ تمام اہلِ زمانہ سے افضل تھا۔ ایسے عالم فاضل مُدبّر اقبال مند جامع الکمالات بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ باوجود اس کمال اور رتبۂ عالی کے خوش مزاج اور لطیفہ گو تھا۔ خود ہندی تھا مگر زبان فارسی میں دستگاہ عالی رکھتا تھا۔ علم کامل ذہن رسا۔ طبع رنگین و موزوں تھی۔ شعر بہت پڑھتا تھا مگر آپ کم کہتا تھا۔ لیکن یہ بھی اُس کی عقلِ صائب کی دلیل ہے کہ شاعری مروّجہ پر متوجّہ نہ ہوا۔ چنانچہ شاعری کو مرضِ روحانی لکھتا ہے۔ سب اہلِ تصنیف کہتے ہیں کہ فنِ انشا میں بے مثل تھا اور تکلّفاتِ مروّجہ سے بالکل احتراز رکھتا تھا۔ اس کی تصنیفات خصوصاً خطوط اور مراسلات کے دیکھنے سے حال اس کی پختگیٔ تدبیر اور معاملہ فہمی اور دقیقہ شناسی کا معلوم ہوتا ہے۔ عبداللہ خاں اُزبک والیٔ ترکستان اکبر کے مراسلات کو دیکھ کر کہتا تھا کہ اکبر کی تلوار سے تو میں نہیں ڈرتا۔ لیکن ابوالفضل کا قلم ہوش کھوئے دیتا ہے۔ اگرچہ اُس نے سیّاحی

نہیں کی لیکن ساتھ لشکر شاہی کے تمام ملک دکن - اضلاع بنگال - وسط ہند - پنجاب - کشمیر - کابل - ٹھٹھہ یعنی علاقۂ سندھ میں پھرا ہے - طبیعت اس کی بالکل حکیمانہ تھی اور خیالات مناسب موقع زمانہ کبھی اُن کو بہت شوکت و شان سے حکما کے طور پر ظاہر کرتا ہے اور کبھی لباس عرفان میں - وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل حسد کی عداوت سے یہ دونو بھائی اور ان کا باپ سالہاسال بخوف جان آوارہ وطن رہے - جب اس کو بادشاہ کے مزاج میں دخل ہوا - تو اُسے ایسی راہ میں لاڈالا کہ کسی مذہب کا پابند نہ رہا - اظہار یہ تھا کہ گزشتہ باتوں کی پیروی کرنی نارسائی عقل کی دلیل ہے - اس واسطے چاہیئے کہ مذہب مذہب صلح کل قرار دیا جاوے اور ہر امر کی خود تحقیقات کی جاوے جب ہر شخص کو اپنا مذہب ثابت کرنا پڑا تو پھر کسی کو ان پر مجال اعتراض نہ رہی اکبر بھی ان کی صحبت کے سبب سے بے قید محض ہو گیا اور طبیعت میں استقلال نہ رہا - چنانچہ جب پادری لوگ کتب مقدسہ اور تصاویر حضرت عیسےٰؑ اور دیگر بزرگان سلف کی اس کے دربار میں لائے - اکبر اُن سے اس طرح پیش آیا کہ اُن کو یقین ہوا کہ عنقریب دین عیسوی اختیار کریگا - لیکن جب ماں اکبر کی مرگئی تو اُس نے بھدرہ بھی کروایا - اس کے علاوہ صدہا رسمیں مذہب ہنود کی بھی جاری تھیں - اُسی طرح جشن کرتے تھے - راکھی باندھتے تھے - دسہرہ کو باز ہاتھ پر بٹھاتے تھے - اب تک بھی دہلی کے شہزادوں میں کسی کے ختنہ نہ ہوتے تھے -

ہر ایک کلام ابوالفضل کا جب علیحدہ دیکھا جاتا ہے تو اُس جگہ پر اُس مذہب خاص میں نہایت صادق العقیدہ معلوم ہوتا ہے - لیکن حقیقت میں جو دیکھا جاتا ہے تو کہیں بھی نہیں - اسی واسطے اکثر مصنف اس کو دہریہ کہتے ہیں خصوصاً عبدالقادر بدایونی اور صاحب مرآۃ الخیال نہایت بُری طرح ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کا علاج سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ تلوار سے

ان کا نام و نشان مٹا دیا جاے ۔ اصل اس کی یہ ہے کہ ایک شخص جو پانچویں پشت میں اس کا دادا تھا یمن سے سیوستان میں آیا اور شیخ خضر اسکے دادا نے ہند میں آکر ناگور میں سکونت اختیار کی ۔ ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک یعنے ابوالفضل کا باپ پیدا ہوا ۔ اُس نے ۱۴ برس کی عمر میں تحصیل سے فراغت پائی اور دریا کی راہ سے دکن میں گیا ۔ وہاں خطیب ابوالفضل گازرانی شاگرد ملا جلال دوّانی نے اُس کو بیٹا کیا اور شفا اور اشارات اور تذکرہ اور مجسطی وغیرہ کتابیں پڑھائیں ۔ وہاں سے آگرہ میں آیا اور دریاے جمن کے کنارے پر سکونت اختیار کی ۔ درس و تدریس کرتا تھا اور توکل پیشہ تھا ۔ شیر شاہ سلیم شاہ نے جاگیر دینی چاہی مگر اس نے منظور نہ کی ۔ ۹۶۲ھ میں اکبر کے پہلے سال جلوس میں ایک سخت قحط پڑا اور ہیمو ڈھوسر نے بلوہ کیا ۔ ۷۰ آدمی زن و مرد گھر میں تھے لیکن اس خوشی سے گزران کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا تھا ۔ لوگ جانتے تھے یہ کیمیاگر ہیں ۔ ابوالفضل اُس وقت پانچ برس کا تھا ۔ بعض دن فقط سیر بھر اناج ہاتھ آتا تھا ۔ مٹی کی ہانڈی میں اُسے اُبالتے تھے اور وہی آب جوش اور دانے آپس میں بانٹ کھاتے تھے گویا روزی کا غم اُس گھر میں بالکل نہ تھا ۔ سواے عبادت اور سیر کتاب کے کچھ شغل نہ تھا ۔ جب عالم میں امن ہوا ۔ شیخ مبارک کا مدرسہ خوب گرم ہوا ۔ علماے مسجد نشین کو حسد نے زور کیا ۔ اور دربار میں اہل علم کو اپنا فکر ہوا ۔ مگر اسے بھی خیال کرنا چاہیے کہ شیخ مبارک آخر ابوالفضل کا باپ تھا ۔ بعض مسائل برخلاف علماے وقت و کتب قدیم کے ظاہر کئے ۔ اہل حسد تعصب پرستوں کو بہانہ ہاتھ آیا ۔ بادشاہ تک نوبت پہنچائی ۔ مگر کبھی خود شیخ مبارک اور کبھی تحریرات مدلل اُس کی جب اکبر کے سامنے گئیں ۔ سب لاجواب ہو گئے ۔ ایک دن شیخ اپنے کسی دوست کے ہاں گیا ۔ ابوالفضل بھی ساتھ تھا ۔ وہاں کسی مسئلہ اختلافی میں تکرار ہوئی ۔ اس کے دماغ میں تازہ

تحصیل کا زور بھرا تھا۔ دلائل زبردست سے ایسا سب کو بند کیا کہ لوگ اس کی کم سنی اور حسن تقریر پر دنگ رہ گئے۔ لیکن افسوس کہ بنیاد عداوت کی مستحکم ہوئی شیخ اپنے بڑھاپے میں اور ابوالفضل جوش علم میں بے خبر تھے۔ دشمنوں کے بہکانے سے ایک شاگرد رشید شیخ کا آدھی رات کو رونی صورت بنا کر آیا۔ فیضی سے کہا کہ سب عالم یہاں کے دشمن آپ کے ہیں اور انہیں کو دربار میں آج کل اختیار ہے۔ پس ان کا ارادہ ہے کہ کل شیخ کو گرفتار کرائیں۔ فیضی اسی وقت باپ کے پاس آیا۔ باپ نے بڑے استقلال سے بیٹے کو تسلّی دی۔ اور ابوالفضل کی رائے بھی یہی تھی۔ لیکن فیضی نے تلوار پر ہاتھ رکھکر کہا کہ دنیا کے معاملات اور ہیں اور توکل اور فقیری اور چیز ہے۔ اگر آپ نہیں چلتے تو میں اپنے تئیں ہلاک کرتا ہوں۔ اسی وقت گھر سے بھاگے۔ ایک دوست کے ہاں آئے مگر وہ بہت بے وفائی سے پیش آیا۔ ابوالفضل نے کہا کہ پھر گھر چلو۔ اگر ایسا موقع ہوا تو تقریر اور مباحثہ میرا ذمہ ہے۔ باپ کی رائے بھی یہی تھی لیکن فیضی نے نہ مانا اور کہا کہ تو ان معاملات کو نہیں جانتا۔ یہاں پیچھے گھر کی ضبطی ہوئی۔ چھوٹا بھائی گرفتار ہو کر دربار میں گیا۔ لیکن اکبر کی منصفی اور رحم ذاتی کے سبب سے رہا ہو گیا۔ تینوں باپ بیٹے برسوں حیران سرگردان رہے اور شہر بشہر گاؤں گاؤں چھپتے پھرے کہیں ٹھکانا نہ ملا۔ وہ تباہی اور دوستوں کی بے وفائی زمانہ کے انقلاب سے عبرت دلاتی ہے۔ اور اُس کم سنی میں ابوالفضل کی دانائی اور دور اندیشی اقبال کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ اُس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ با وجود عمومی جہالت زمانہ کے اقبال خداداد نے اکبر کو کس قدر ملک کے جزو کل حالات سے آگاہ کر رکھا تھا۔ اسی حال میں ان کے کسی دوست نے انہیں نہایت احتیاط سے چھپا رکھا تھا اور فیضی بھیس بدل کر فتح پور میں دربار شاہی کی خبر لینے آیا تھا۔ وہاں سُنا کہ ارکان دربار میں سے کسی شخص نے بادشاہ کو

سمجھایا کہ یہ کیا قرب قیامت اور آخری دَور ہے کہ ایسے ایسے عالم فاضل نفس بدستِ حسد مشربوں کی عداوت سے اس طرح خانہ برباد اور تباہ پھرتے ہیں اور آپ خبر نہیں لیتے ۔ آپ کی سرکار سے ملک خزانہ سے وظیفہ اُس نے نہیں کھایا پھر اُس کو عذاب میں کیوں گرفتار کر رکھا ہے ۔ بادشاہ نے کہا مَیں کیا کروں سب نے اُن کے کفر پر فتوے لکھے ہیں اور میں یہاں تک جانتا ہوں کہ فلانی جگہ اب وہ موجود ہیں لیکن جان بوجھ کر تغافل کرتا ہوں اور ہر ایک کو جواب دے دیتا ہوں ۔ بہتر ہے کہ آج شیخ کو بھی بلاؤ اور سب عالم جمع ہوں تاکہ اس بات کا فیصلہ ہو جائے ۔ فیضی کو بھی یہ خبر لگی ۔ سُنتے ہی بھاگا اور آن کر باپ کو خبر دی ۔ مثل ہے کہ مار گزیدہ رسّی سے بھی ڈرتا ہے ۔ یہ وہاں سے بھی فرار ہو گئے ۔ چند روز پریشان رہے ۔ آخر جان سے سیر ہو کر آگرہ میں آئے ایک دوست کے گھر میں چھپکر بیٹھے اور اِدھر اُدھر کاغذ کے گھوڑے دوڑانے لگے ۔ غرض دوست آشنا تدبیرات مُناسب سے دربار میں لے گئے اور وہ بلا سر سے ٹل گئی ۔ شیخ مبارک چونکہ ابوالفضل سے ایک خاص موافقت طبیعت کی رکھتا تھا اس لئے اُسے ساتھ لے کر دلّی گیا ۔ اس عرصہ میں تقدیر نے یاوری کی ۔ پہلے فیضی پھر ابوالفضل ۲۴ برس کی عمر سنہ ۱۹ جلوسی میں دربار میں پہنچا ۔ اوّل میر منشی بعد ازاں وزیر اعظم ہو کر بادشاہ کے مزاج میں ایسا دخل پیدا کیا کہ تمام ارکانِ دولت اور شاہزادے رشک کرتے تھے ۔ اُس نے عہد کیا تھا کہ جن جن لوگوں نے شیر شاہ اور ہمایوں اور ابتدائے عہد اکبری میں خبثِ طینت حضور رسی کے سبب سے اُسے ایذائیں پہنچائی تھیں اور جان اور مال سے لیکر ننگ و ناموس اور خانہ بربادی تک کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا اُن سے بدلا نہ لیگا ۔ لیکن شیخ نے واسطے سزا دہانی بدخواہوں کے بہت نصیحتیں کیں ۔ اس واسطے بادشاہ کے سامنے اُن کے غبن اور فساد اور بے لیاقتی کے سب حالات اصلی اصلی بیان

گئے کہ دشمن خود بخود سزا کو پہنچے ؎

عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک جو بہشت اور دوزخ تک کے قبضے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے غبن اور رشوتوں میں ایسے ذلیل ہوئے کہ سوا ئے جج کے دوسرا رستہ نہ ملا اُن کے گھروں میں بڑی بڑی قبریں بنی ہوئی تھیں کہتے تھے کہ بزرگوں کے مزار ہیں مگر جب اُنہیں کھدوایا تو فقط سونے کی اینٹیں اُس میں سے نکلیں۔ آخر عمر میں شیخ مبارک نے درس تدریس چھوڑ دی تھی مگر علم الٰہیات میں تصنیفات جاری تھیں۔ آخر ۱۰۰۱ھ ہجری میں لاہور میں مرگیا۔ عبدالقادر بدایونی اس کا شاگرد تھا۔ لکھتا ہے کہ شیخ ہر علم میں فضیلت کا مرتبہ رکھتا تھا اور عالم ہمہ داں جس کو کہتے ہیں شیخ مبارک کے سوا دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر اس کے خیالات سے رنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کچھ الفاظ بد نہیں کہتا۔ غالباً شاگردی کی رعایت سے ہوگا ؎

ابوالفضل لکھتا ہے کہ میں ۹۵۸ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ ۱۲-۱۳ مہینے کا تھا جو باتیں کرنے لگا۔ پانچ برس کا تھا کہ پڑھنے بیٹھا۔ ۱۵ برس کی عمر میں تحصیل سے فارغ ہوا۔ علوم درسی سے اکثر دل اُچاٹ رہتا تھا۔ باپ نے ہر علم میں ایک ایک رسالہ مختصر تصنیف کر کے یاد کروایا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ دل ہی دل میں اعتراض سوجھتے تھے مگر ادا نہ کر سکتا تھا۔ چند روز کے بعد ایک شخص سے دوستی ہوئی اُس کے سبب سے خود بخود طبیعت بدل گئی اور پڑھنے کا شوق ہوا۔ جس کتاب کو دیکھتا تھا اُستاد سے بھی زیادہ باریکیاں سمجھ میں آتی تھیں۔ دس برس تک طالبعلموں کی تعلیم میں ایسا مصروف رہا کہ دن رات اور بھوک پیاس کی خبر نہ تھی۔ لوگ تعجب کرتے تھے اور اکثر معتقد ہوتے تھے۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ اس کا کچھ تعجب نہیں۔ بیماری میں طبیعت انسان کی مرض کے دفع پر متوجہ ہوتی ہے تو کھانے پینے سے دل بیزار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر دل بالکل علم کی طرف متوجہ ہو جائے تو بھوک پیاس کے بند ہو جانے کا تعجب نہیں تکمیل علم

سے پہلے اس کا یہ حال تھا کہ جو جو نئے مطالب بیان کرتا بسبب اسکی کم سنی کے عالم فاضل مانتے نہ تھے لیکن میر سید شریف اور علامہ تفتازانی کی گفتگو میں جو اکثر تقریریں اس نے کی تھیں شاگرد لکھتے گئے تھے - جب ملا قاسم کی تصنیف سے ایک کتاب آئی اور اُس میں وہی تقریریں درج دیکھیں تو قائل ہوئے - ایک دفعہ کتاب حاشیۂ اصفہانی ایک شخص لایا کہ آدھے آدھے ورق اُس کے دیمک کھا گئی تھی اور کامل کتاب نہ ملتی تھی - اس نے سفید کاغذ کے پیوند لگائے اور انداز سے خود کتاب کو مکمل کیا - چند روز بعد پورا نسخہ ہاتھ آیا مقابلہ کیا تو بالکل مطابق تھی صرف پانچ چار جگہ مترادف لفظوں کا فرق تھا - جو جو نعمتیں قابل شکر کے خدا نے اسے عطا کیں - اکبر نامہ کے آخر میں لکھتا ہے - ۳۱ فقرہ ہیں اکثر معمولی مضمون ہیں لیکن بعض دفعات جن سے اس کی طبیعت اصلی کا حال بھی معلوم ہو لکھے جاتے ہیں :-

(دفعہ ۲) پچھلے بزرگ اپنے زمانہ کے غیر بادشاہوں کے عدل پر فخر کرتے ہیں میں اگر اس بات پر شکر کروں کہ بادشاہ ظاہر و باطن کے وقت میں پیدا ہوا تو عین بجا ہے - (یہ اشارہ ہے اُس حدیث پر کہ آنحضرت فخریہ کہا کرتے تھے کہ میں بادشاہ عادل یعنی نوشیرواں کے وقت میں پیدا ہوا ہوں - ابو الفضل درحقیقت اُس کے غیر مذہب ہونے پر طعن کرتا ہے) ۔

(دفعہ ۱۶) اگرچہ باپ مجھے ایک خاص راہ پر لگاتا تھا لیکن میری طبیعت سب طرف نظر دوڑاتی تھی ۔

(دفعہ ۱۸) جو عشق کہ خاندان نباہ کرتا ہے مجھے اُس نے منزل کو پہنچایا ۔

(۲۱) بادشاہ کی برکت خدمت سے خدا نے نعمت صلح کل عطا کی چنانچہ اوّل خاموشی اور بعد اُس کے ہر فرقہ کی ملاقات سے دل میں سب کی موافقت پیدا ہوئی - خدا عقل کی روشنی سے دل کی بدی دور کرے ۔

(۲۴) خدا نے سعادتمند بھائی عطا کئے۔ بڑا بھائی فیضی باوجود کمالات ظاہری و باطنی کے میری بے اجازت کے ایک قدم نہیں اُٹھاتا تھا چنانچہ اپنے ایک قصیدہ میں بھی خود میرے باب میں کہتا ہے ؎

صد سالہ رہ میان من و اوست در کمال	در عمر اگر ازو دو سہ سالے فزون ترام

چھوٹا بھائی شیخ ابوالبرکات ۹۶۰ھ ہجری میں اور شیخ ابوالخیر ۶۷ھ میں۔ ابوالمکارم ۷۶ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے علوم درسی باپ سے اور میر فتح اللہ شیرازی سے پڑھے۔ شیخ ابوتراب ۸۰ھ میں پیدا ہوا اگرچہ اس کی طبیعت اور ہے مگر سعادتمندی وہی ہے۔ شیخ ابوراشد اور ابوحامد ۱۰۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی حمل میں تھے کہ باپ اُن کے نام رکھ کر فوت ہوا۔

(۲۵) شرم وحیا اور عقل ودانش کے خاندان سے جورو ملی کہ گھر کو رونق اور نفس کو بندش حاصل ہوئی اور ایک ایک بی بی ہندوستانی اور ایرانی اور کشمیرن سے دل کو خوشی حاصل ہوئی۔ (یہ کثرت ابوالفضل کی طبع حکیمانہ کے خلاف ہے البتہ ہند کی ہوائے عیش انگیز اور جاہ ودولت کی تاثیر کہی جائے تو عجب نہیں)۔

(۲۶) ۹۸۹ھ میں عبدالرحمن نام ایک بیٹا عطا کیا۔ اگرچہ ہندوستانی ہے لیکن طریق یونانی رکھتا ہے۔ بادشاہ نے اُسے بھائی کہا ہے۔ اور پشوتن کہتے ہیں۔ پشوتن کیانیوں کے خاندان میں ایک شاہزادہ ہوا ہے کہ اس نے عمر جاوید پائی ہے۔ بعض لوگ اسے کاؤس کا بیٹا کہتے ہیں۔

(۲۹) نفس ناطقہ کے باب میں سالہا سال تک سوچتا رہا اور ہر فرقہ کے عالموں سے گفتگو رہی۔ منطق اور اشراق وغیرہ سب کی دلیلوں کو دیکھا کہیں تشفی نہ ہوئی۔ آخر یہی ثابت ہوا کہ اس صورت ظاہری سے علاوہ کوئی لطیفۂ ربانی ہے کہ اُس کو اس جسم سے تعلق ہو گیا ہے۔

دفعات مذکورۂ بالا اور اس کی تصنیفات متفرقہ سے اس کی بلندی ہمت اور

آزادی طبع ظاہر ہوتی ہے جس کو کسی دین اور آئین کے تحت میں رہنا گوارا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے کلام میں کوئی حکیم یا عالم فاضل سلامت نہیں نکلا جسے جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جس مقام میں اس کے کلام کو دیکھا جاتا ہے کہیں مرتبہ سے گرتا نہیں۔ ایسی شان و شکوہ سے تحریر کرتا ہے کہ اس کے آگے طرف ثانی کی کچھ حقیقت نہیں رہتی۔ جب اس کی ماں کا انتقال ہوا۔ شیخ مبارک نے سفر کعبہ کا قصد کیا۔ ابوالفضل نے صبر و تسلی اور اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے ایک خط لکھا۔ اس اس طرح نصیحت اور فہمایش کرتا ہے کہ یقین ہے شیخ بھی دیکھ کر بہت شرمایا ہوگا۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ جن کے دل نور حقیقت میں ہیں اُن کو خاک تودہ اور مٹی کے ڈھیروں کا دیکھنا کس نے واجب کیا ہے۔ مراد اس سے کعبہ اور صفا و مروہ ہے۔ بڑے بڑے نامی علما و حکمائے متقدمین کی کتابوں پر خاتمہ لکھے اپنی رائے اس طرح لکھتا ہے جیسے کوئی مدرس ایک طالب علم کی رپورٹ کرتا ہے ؂

اس کی تصنیفات میں ایک مفصّل و مطوّل کتاب آئین اکبری ہے جو کہ ایک دستورالعمل کل امورات سلطنت خصوص بندوبست و مالگزاری کا ہے اُسکے دیکھنے سے آئین بندی اور قانون تراشی اس کی طبیعت کی واضح ہوتی ہے۔ اُس زمانۂ جاہلیت میں جبکہ کسی بات کے لئے کوئی قاعدہ نہ تھا ایسے خیالات کا ہونا نہایت عجب ہے۔ عبارت اُس کی بہت مختصر چھوٹے چھوٹے فقرے اور سب طرزوں سے جدا ہے۔ اگرچہ اُس کی ہر تحقیق قابل یاد رکھنے کے ہے لیکن جغرافیہ کے باب میں لکھتا ہے کہ دانایانِ فرنگ نے ایک نیا جزیرہ فی الحال دریافت کیا ہے۔ وہاں کے آدمی ایسے ناواقف ہیں کہ جہاز سے جو لوگ وہاں اُترے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر پھرنے لگے تو وہاں کے لوگوں نے جانا کہ گھوڑا مع سوار ایک مخلوق ہے۔ اور اُس کو نئی دُنیا کہتے ہیں (مراد اس سے

امریکا ہے) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد میں بھی سراغ تحقیقات
اکبر کا یہاں کچھ نہ کچھ پہنچنے لگا تھا۔ اکبرنامہ ایک نہایت مطوّل تاریخ آغاز ترک سے
مجملاً اور حالِ بابر و ہمایوں و اکبر میں ۴۲ سنہ جلوسی تک مفصّل ہے۔ اُسکی عبارت
کجکول میں بھی کہیں کہیں طرز آئین اکبری کی ملتی ہے۔ ۳۔ کجکول جس میں مختلف کتابوں
کے چیدہ اور پسندیدہ مضمون اور دلچسپ عبارتیں انتخاب کرکے لکھی ہیں۔ یہ
کتاب راقم نے خاص ابوالفضل کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہے۔ خط اس کا
عیا مولویانہ تھا یعنی خوش خط نہ تھا۔ عیار دانش یعنی کلیلہ دمنہ زبان عربی سے
فارسی میں بفرمایش اکبر لکھی۔ اس کی عبارت اُس مرتبۂ عالی پر نہیں جو اُس کا اصلی
انشا طریقہ ہے۔ انشاے ابوالفضل مروّج اور نہایت کارآمد کتاب ہے اُسے فارسی
کی عبارات اور دنیا کے معاملات کا دستور العمل کہنا چاہیئے۔ خصوصاً دوسرا دفتر جس میں
اکثر اراکین دولت اور صاحب کمالوں کو اپنی طرف سے خطوط لکھے ہیں۔ اور تیسرا
دفتر جس میں دیباچہ اور خاتمہ وغیرہ۔ اکثر عبارتیں بعض کتب متقدمین پر لکھی ہیں۔ حقیقت
حقیقت مسائل حکمت اور الہیات کا ایک گلزار ہے۔ بروقت ملازمت کے ابوالفضل نے
تفسیر آیۃ الکرسی کی نذر گزرانی۔ علاوہ اُس کے سورۂ فتح کی تفسیر زبان عربی میں لکھی اور
نام اُس کا تفسیر اکبری رکھا کہ یہی تاریخ تصنیف ہے۔ بداؤنی کہتا ہے کہ وہ حقیقت
۹۸۳
میں شیخ مبارک کی تھی ۔

اس حکیمانہ طبیعت اور علم و فضل پر شجاعت اور بہادری اُس کی قابل تعجب
جب حسب الحکم بادشاہ کے احمدنگر پر چڑھا تو اُس کا قلعہ ایسے عمودی پہاڑ پر واقع
تھا کہ پہنچنا فوج کا وہاں نہایت دشوار تھا۔ مگر ابوالفضل نے لوہے کی میخیں
گڑوا کر اور کمندیں اور طنابیں ڈال کر خود سو آدمیوں سے چڑھ گیا اور اپنی ہمّت
مردانہ سے قلعہ فتح کیا اور ایک بار نہیں بلکہ بہت دفعہ اسیر وغیرہ میں ایسے
ایسے عجیب و غریب معرکے اُس نے کئے اور کامیاب ہوا اور پنجہزاری اور

سپہ سالاری کا منصب عالی حاصل کیا۔ چونکہ اکثر اتالیقی و تربیت شاہزادوں کی اس حکیم دانا کے سپرد ہوتی تھی۔ اس لئے ۱۰۰۶ہجری میں شاہزادہ مراد کے ساتھ احمد نگر ملک دکن پر فوج کشی کی۔ جب وہ مر گیا تو شاہزادہ دانیال کے ساتھ تھا۔ ۱۰۰۹ھ میں اُس مہم سے فراغت پائی۔ اصل حال یہ ہے کہ شیخ کو بادشاہ کے مزاج میں دخل بہت تھا اور وہ دخل حقیقت میں بھی بجا تھا کیونکہ جامع علوم اور مجمع فضائل و کمالات تھا۔ خواہ علمی خواہ مذہبی کوئی رشتہ ہو اصل حقیقت سے غرض رکھتا تھا۔ جزئیات ظاہری کی پروا نہ کرتا تھا۔ ساتھ اس کے علم کا دریا سینہ میں تھا۔ مدرسہ کے مولوی اور مسجد کے مُلّا نے سامنے آتے تو دم نہ مار سکتے۔ نظم نثر زور تحریر کا یہ حال کہ اکبر نامہ۔ آئین اکبری وغیرہ موجود ہیں۔ عبداللہ خاں جیسا بادشاہ ماوراءالنہر میں بیٹھا کانپتا تھا۔ شمشیر کے میدان میں جاں باز سپاہیوں سے بیش قدم تھا۔ تدبیر ملک۔ حساب کتاب میں ادنے متصدی سے لے کر دیوان اعلےٰ تک کا کام آپ کر سکتا تھا۔ باوجود اس کے جو گرگ سیرت عالم قدیم سے رکن سلطنت بنے ہوئے تھے اور اُن کے ہاتھوں باپ نے اور اس نے مصیبتیں بھری تھیں اُن کا اور اُن کے آوردوں کا استیصال کر کے اُن کے طرفداروں کے بندوبست میں بھی رہتا تھا۔ ان سب باتوں پر نظر کرو تو کسی سررشتہ کا اور کسی فن کا صاحب کمال ایسا نہ تھا کہ جو اس سے کھٹکتا نہ ہو۔ ابتدا میں جب تک زمانہ کی برگشتگی نے جان سے عاجز کر رکھا تھا تو یہ رباعی کہی تھی اسی کو پڑھا کرتا تھا۔ رباعی

یارب بجہانیاں وسیلے بفرست	نمرود صفت چو پشہ پیلے بفرست
فرعون وشاں دست برآوردستند	موسیٰ و عصا و رود نیلے بفرست

پھر جبکہ زمانہ نے پلٹا کھایا اور یکایک ستارا چمکا تو اگرچہ اکبر کی عقل کی کنجی تھا اور قدیمی دشمن گورستانِ ادبار میں پیوند ہو گئے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ پہلے تو فقط گنتی کے تھے اب ہزاروں مخالف دکھائی دینے لگے کیونکہ کاروبار اور تعلقاتِ سلطنت

ب کی
التواریخ
تواریخ
نامہ

کی کچھ حد نہ تھی۔ اُس وقت میں گھبراکر یہ رباعی پڑھا کرتا تھا۔ رباعی

آتش بدو دست خویش درخرمنِ خویش	چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمنِ خویش
کس دشمنِ من نیست منم دشمنِ خویش	اے وائے من و دستِ من و دامنِ خویش

چونکہ شاہزادے تک بھی اُس کے دشمن تھے اسی واسطے وہ ہمیشہ بادشاہ سے کہا کرتا تھا کہ فدوی کو سوائے حضور کے اور کسی سے غرض نہیں ہے۔ غرض کہ ۱۰۰۹ھ ہجری میں احمدنگر کی مہم سے فراغت کرکے انتظام اضلاع دکن میں مصروف تھا کہ ۱۰۱۰ھ میں دفعتاً بادشاہ نے جریدہ طلب کیا۔ اپنے بیٹے عبدالرحمن کو اپنی جگہ چھوڑا اور آپ فوراً روانہ ہوا۔ اور ضرورت یہ تھی کہ اتفاقاً جہانگیر یعنی ولیعہد اکبر اپنے باپ سے برگشتہ ہوگیا تھا۔ اور وہ بلکہ ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اکبر جو کچھ کرتا ہے ابوالفضل کی صلاح سے کرتا ہے۔ جہانگیر کو بھی خیال تھا کہ یہ کدورت ابوالفضل کے اغوا سے ہوئی ہے۔ بس اس خیال سے کہ اگر یہ بھی اکبر کے پاس آ پہنچا تو تدابیر مخالفہ کو زیادہ قوت حاصل ہوگی۔ راجہ نرسنگھ دیو بوندیلہ کو کہ وہ بھی شریک بغاوت تھا حکم دیا کہ رستہ میں شیخ کو مار ڈالے۔ جبکہ شیخ اس کے قریب مقام انتری میں پہنچا اپنی جمعیت قلیل سے آگے آگے مع ایک سردار افغان و دو تین سواروں کے چلا جاتا تھا۔ فوج دشمن کی سیاہی اس طرف معلوم ہوئی۔ افغان مذکور نے کہا کہ یہاں سے چند کوس پر ایک گروہ فوج شاہی کا اُترا ہے۔ تم بھاگ کر اُن میں جا ملو۔ پچھلے آدمی ہمارے بھی آتے ہیں۔ میں اس عرصے میں اُن کو مصروف جنگ رکھونگا۔ اگرچہ بسبب کمی کے ہم سب مارے جائینگے لیکن آپ کی جان بچ جائیگی۔ ابوالفضل نے نہایت بہادری سے جواب دیا کہ اے خان میں ایک مسجد کے ملّانے کا بیٹا ہوں۔ بادشاہ نے مجھ کو اس مرتبے کو پہنچایا اور اُسے مجھ پر بڑے بڑے بھروسے ہیں۔

اس رہزن کے آگے سے جان کا ڈر کرکے بھاگنا اور بادشاہ کے اُن سب خیالوں کو باطل کر دینا شرم و حیا سے بعید ہے ۔ تلوار لے کر ڈٹ گیا اور نہایت مردانگی سے جان دی ۔ سچ ہے ؎

رستم یہاں رہا ہے نہ یہاں سام رہ گیا	مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

باغی مذکور سر کاٹ کر سلیم کے پاس لے گیا اُس نے ایک مقام نجس و ناشایستہ میں ڈلوا دیا ۔ جب اکبر نے یہ خبر سُنی ایسا غم و افسوس کیا کہ بیان نہیں ہو سکتا بیقرار ہو کر کئی دفعہ ہاتھ سینے پر مارا اور کہا کہ افسوس ہے یار غمگسار اور رونق دربار ہمارا اس حال سے مارا گیا ۔ دو دن اور دو رات کھانا نہ کھایا ۔ عبدالرحمٰن پسر ابوالفضل کو مع بعض امرائے مدبّر واسطے قتل راجہ نرسنگھدیو کے روانہ کیا اور کہا کہ جب تک اُس کا سر نہ لو تب تک پھر کر نہ آنا ۔ پھر کہا کہ شیخ کے عوض میں اُس راہزن کا سر کیا حقیقت رکھتا ہے خبر اُس کے تمام بال بچوں کو کولھو میں پیل دو اور ملک کو ستیاناس کر دو ۔

چونکہ در پردہ سب لوگ ابوالفضل سے رشک رکھتے تھے اور عقیدے کا حال بھی مشہور تھا ۔ اعظم خاں کوکلتاش نے یہ تاریخ کہی ؎

یفعل اللہ ما یشاء یحکم اللہ ما یرید	تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید

اکبر آباد میں اکبر کے مقبرے سے کوس بھر جانب شرق ایک عمارت عالی لاڈلی کا مقبرہ مشہور ہے ۔ لاڈلی بیگم ابوالفضل کی بہن تھی اُس کا شوہر اسلام خاں تھا ۔ اُس مقبرہ پر نام شیخ مبارک اور ابوالفضل کا لکھا ہے عجب نہیں کہ یہ بھی وہیں مدفون ہو ۔

اکبر نامہ میں ابوالفضل نے کئی جگہ لکھا ہے کہ گیتی خداوند دریائے راوی کے پار آہو خانہ کے دیکھنے کو یا شکار کو گئے اور پھرتے ہوئے فضل آباد میں میرے مکان پر آئے ۔ مگر دریافت کیا گیا اس نام کا نشان بھی نہیں ۔

کمال اسمٰعیل اصفہانی خلّاق معانی

یہ صاحب فضل وکمال بیٹا عبدالرزاق اصفہانی کا تھا کہ وہ بھی اپنے وقت میں شاعر نامی تھا۔ مرزا الغ بیگ ابن تیمور باپ بیٹوں کے اشعار کو سُنا کرتا تھا اور خوش ہو ہو کر کہتا کہ لوگ باپ کو بیٹے کا بزرگ کہا کرتے ہیں۔ دیکھو تو یہ بیٹا باپ کا فخر ہے یا نہیں۔ علاوہ خوبیٔ زبان کے مضامین اس قدر عالی پیدا کرتا تھا کہ شاعروں میں اس کا خطاب خلاق معانی مشہور ہے نام لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اکثر قصیدے اس زور شور کے لکھے ہیں کہ اُن کا جواب نہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

بخاک پائے تو کاب حیات ازاں بچکد	اگر مسوّدۂ شعر من بفشاری
سزد کہ خواری وحرماں کشد معانی من	بلے کشند غریباں ہر آئینہ خواری

بادشاہوں اور حاکموں کی بارگاہ میں نہایت معزّز تھا اور انعام واکرام حاصل کرتا تھا اس لئے امیرانہ گزران کرتا تھا۔ اہل ضرورت کو دستگیری کے طور پر بھی اور قرض بھی دیتا رہتا تھا۔ لطیفہ۔ ایک دفعہ اکثر لوگوں نے اس سے خلاف وعدہ اور بدمعاملگی کی جب بہت ناچار ہوا تو جل کر یہ قطعہ کہا ؎

اے خداوند ہفت سیّارہ	ظالمے را فرست خونخوارہ
تا درِ دشت را چو دشت کند	جوے خوں آورد ز جو بارہ
عددِ مرد ماں بیفزاید	ہر یکے را کند دو صد پارہ

اُس کی مالداری کے ساتھ مرنے کا حال عجب حسرتناک ہے کہ آل چنگیز میں سے اکتائی قاآن نے اصفہان پر لشکرکشی کی اور فتحیاب ہوا۔ مغل گھر بگھر لوٹتے پھرتے تھے اور لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ کمال نے اور اس کے ہمسایوں نے تمام

مال اسباب اپنا اسی کے مدرسہ کے کوئیں میں ڈال دیا تھا کہ جب امن امان ہوگا تو نکال لینگے۔ اتفاقاً ایک مغل اس کے گھر میں بھی لوٹتا ہوا آیا۔ گھر میں مال اسباب کچھ نظر نہ آیا۔ صحن میں درخت پر کوئی جانور بیٹھا تھا مغل نے اُس کے تیر مارا جانور تڑپھکر کوئیں میں جا پڑا۔ مغل نے کوئیں میں جھانک کر دیکھا تو پانی نہ معلوم ہوا اور نہ نزدیک نظر آئی۔ جھٹ کود پڑا۔ اندر معلوم ہوا کہ اس میں اسباب دبا ہوا ہے۔ اُسی وقت اور مغلوں کو لایا۔ نکالا تو گنج قارون نکلا۔ مگر اُن وحشی ظالموں نے اُس پر قناعت نہ کی۔ کمال کو پکڑکر اور روپیہ مانگا اُس نے انکار کیا۔ اُن لوگوں نے نہایت سختی کی شکنجہ میں کس دیا اور انواع و اقسام کی تکلیفیں دیں یہاں تک کہ اُسی حالت میں مرگیا۔ کہتے ہیں کہ مرتے ہوئے یہ رباعی کہی۔ رباعی

دل خوں شدہ شرط جانگدازی اینست	در حضرت او کمینہ بازی اینست
با اینہمہ من ہیچ نمے آرم گفت	شاید کہ مگر بندہ نوازی اینست

اور یہ واقعہ ۶۳۵ھ ہجری میں ہوا۔ اس شاعر کا کلام قابل دیکھنے کے ہے۔ زبان نہایت صاف اور بامحاورہ اور اس پر مضمون نیا اور ترکیب لفظوں کی نہایت چست اور بندش درست۔ یہی سبب ہے کہ بہت سا مضمون تھوڑے سے الفاظ میں اس طرح آگے پیچھے کرکے بٹھاتا ہے کہ دوسرے سے ممکن نہیں۔ چونکہ صاحب علم تھا اس لئے اس کے کلام میں فقط مضامین شاعرانہ ہی نہیں بلکہ مطالب حکمۃ نصیحت آمیز بھی ہوتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیمانہ مزاج رکھتا تھا۔ باوجود اس کے خوش طبع اور شگفتہ مزاج بھی تھا۔ کیونکہ ہجو بھی خوب کہتا ہے۔ چند اشعار اُس کے بطریق مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں جس سے اُس کا اور اُسکی طبیعت کا حال بھی کچھ کچھ ظاہر ہوگا

ہجا گفتن ارچہ پسندیدہ نبود	مبادا کسے کآلت آں ندارد
خداوند امساک راہست ورو ے	کہ غیر ہجا ہیچ درماں ندارد

چو نفریں بود بولہب را ز ایزد ... مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد
ہر آں شاعرے کو نباشد ہجا گو ... بود ہمچو شیرے کہ دنداں ندارد

رباعی

گر چاشنیٔ غمش بیابی یکدم ... ہرگز نخوری تو از پئے شادی غم
شادی غم اوست خود و لیکن چہ کنم ... چوں تو نہ شناسی غم و شادی از ہم

رباعی

نزدیک من از شرم و جفاہاے نہاں ... باریک کنی ہمہ تن خود چو میاں
وز شادی و عیش درکنار دگراں ... چنداں بالی کہ در نہ گنجی بجہاں

لطیفہ - ایک دفعہ قحط پڑا خواجہ ابو العلا شہر خوارزم کے صدر کی تعریف میں یہ قطعہ کہہ کر بھیجا - کہتے ہیں کہ خواجۂ مذکور نے بہت انعام دیا اور بعد اس کے بھی سلوک کرتا رہا - قطعۂ مذکور یہ ہے - قطعہ :-

اے خداوندا کہ اندر خشک سالِ قحط و جود ... پختہ شد از آب انعامِ تو نانِ گرسنہ
زانکہ تو مشہور آفاقی بناں دادن چو صبح ... سر بدرگاہت نہادہ است آسمانِ گرسنہ
سیلِ انعامِ تو ہر دم بردِ ثاقِ سائلاں ... آں چناں افتد کہ آتش بہ زوانِ گرسنہ
شکل اخلاقِ حسودت گر کشم بر روے ناں ... بوے آں ناں خود بگرداند عنانِ گرسنہ
ہمچو مشرق قرص گرمش مے فرستد جود تو ... ار دہندت زاں سوئے مغرب نشانِ گرسنہ
نیست بے یاد سخاوت داستانِ اہلِ فضل ... آرے از ناں نیست خالی داستانِ گرسنہ
اندریں دوراں کہ میگردد سیہ از دود فقر ... روے ماہ و قرص خورشید از فغانِ گرسنہ
گشتہ بے رماں بجوں یکدگر تشنہ چنانکہ ... ناں ہمے آرند بیروں از دہانِ گرسنہ
پرّ دلاں را ناں بسیر از لقمہاے بیوہ زن ... کرد ناں را دیگ چرب از گردانِ گرسنہ
ہر کجا دیدی دو ناں پیدا بدستِ عاجزے ... ورز ناں بینی بدو باراں سنانِ گرسنہ
برگذار ناں دہنہا باز کردہ چوں تنور ... تیغ داراں ہمچو آتش خوں فشانِ گرسنہ

ترسم آید از زبانِ من خطائے در وجود — زانکہ دارد رنگ دیوانہ جوانِ گرسنہ
خواجگانے راکہ باشد معدۂ انبار سیر — احترازے کرد باید از زبانِ گرسنہ
زانکہ از آتش نباشد پنبہ را چنداں خطر — کاہلِ نعمت راکنوں از شاعرانِ گرسنہ
میزبانِ لطف راگو تاکہ باشد تازہ رو — زانکہ ناخواندہ رسیدش میہمانِ گرسنہ
دفع کن ز انبار خود عین الکمال از بہر آنکہ — چشم را تاثیر باشد خاصہ زانِ گرسنہ
کرد مستغنی ز تعریف ایں ردیفِ شعر زانکہ — بر سرِ ایں گفتہ بنوشتم فلانِ گرسنہ

باد در چنگِ حوادث خصم پر آہوئے تو
ہمچو آہو در کفِ شیرِ ژیانِ گرسنہ

ایک سال جو اُس کے ہاں سے غلہ آیا تو اُس میں خاک بہت تھی کمال الدّین نے یہ قطعہ کہا ۔ قطعہ :—

غلہ کامسال خواجہ داد مرا — گرنہ بُد جُملہ بود اکثر خاک
اندر انبارِ من بدولتِ تو — ہست از بادیہ فزوں تر خاک
خاک مردم خورد ندانستم — کہ خورد مردم اے برادر خاک

باچنیں بخشش و چنیں انعام
بر سرِ شعر و کلک و دفتر خاک

خواجہ سلمان ساوجی

خود صاحب کمال اور با اعزاز تھا اور خاندان اس کا بھی صاحب کمال اور بادشاہوں کے دربار میں معزز اور مکرّم تھا۔ باپ اس کا خواجہ علاؤ الدّین فنِ سیاق میں یگانۂ زمانہ اور دربارِ شاہی میں پیش دست تھا۔ چونکہ اچھوں کے اچھّے ہوتے ہیں اور سامان بھی سب طرح کا موجود تھا۔ اس لئے سلمان نے بھی سب علموں میں مداخلت پیدا کی اور شعر میں کمال حاصل کر کے سلطان اویس ایلکخانی کے دربار میں مصاحبت کا مرتبہ حاصل کیا۔ شاعروں میں جو عزّت سلمان نے پائی اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور خوبیٔ کلام کا بھی یہ حال ہے کہ علاؤ الدولہ سمنانی کہتا ہے کہ دو چیزیں دُنیا میں بے نظیر ہیں۔ ایک انارِ سمنان۔ دوسرے شعرِ سلمان کیونکہ ساوہ جو وطن اس کا ہے سمنان ہی کا علاقہ ہے۔ امیر شیخ حسن نوبان حاکم بغداد و آذربائجان کا اور دلشاد خاتون بھی اس کی بڑی مربّی تھی۔ اور خواجہ اویس بادشاہ کا بڑا بیٹا کہ حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھا اور کتبِ تواریخ میں ضرب المثل کے طور پر اس کا ذکر لاتے ہیں۔ وہ خواجہ سلمان سے شعر کی اصلاح لیتا تھا۔ اس سبب سے زیادہ تر اشعار کو شہرت ہوئی۔ اپنے اِس یوسف جمال شاگرد کو اصلاح دیتے ہوئے ایک دفعہ یہ غزل کہی۔ غزل:۔

آوازۂ جمالت تا در جہاں فتادہ ‌ ‌ ‌ خلقے بہ جستجویت سر در جہاں نہادہ
سودائیانِ زلفت گرد تو حلقہ بستند ‌ ‌ ‌ شوریدگانِ مویت درہمسد گرفتادہ
مائیم بستہ دل را و ز لعل دلکشایت ‌ ‌ ‌ آں لب بخندہ بکشا تا دل شود کشادہ
اے شہسوار خوباں وے عینِ آبِ حیواں ‌ ‌ ‌ رحم آوری چہ باشد بر تشنۂ پیادہ

سلماں زخش ببازی شہمات عافیت کرد
بازی مگر کہ دادت باز ایں حریف سادہ

اُس نے اس خاندان کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے - چنانچہ کہتا ہے ؎

من ازیمن اقبال ایں خاندان
گرفتم جہاں را بہ تیغ زباں

من از خاوراں تا درِ باختر
زخورشید امروز مشہور تر

اس تقرّب کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ :-

نقل - ایک دن سلطان اویس مشق تیر اندازی کی کر رہا تھا - اور سعادت اُس کا غلام تیر اُٹھا اُٹھا کر لاتا تھا - سلمان نے اُس وقت بدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

شہا تیر در بند تدبیر تست
سعادت رواں در پئے تیر تست

چو در بارِ چاچی کماں رفت شاہ
تو گوئی کہ در برج قوس است ماہ

دو زاغِ کماں با عقابِ سہ پر
بدیدم بیک گوشہ آوردہ سر

نہادند سر بر سرِ دوش شاہ
ندانم چہ گفتند در گوش شاہ

چو از شست بکشاد خسرو گرہ
بر آمد ز ہر گوشہ آواز زہ

شہا تیر در بندِ تدبیر تست
سعادت رواں در پئے تیر تست

بعہدت ز کس نالہ بر نخاست
بتیر از کماں گر بنالد رواست

کہ در عہد سلطانِ صاحبقراں
نہ کردہ است کس زور جز بر کماں

بادشاہ حسن کر بہت خوش ہوا اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ دن رات میں کسی وقت اُس کی جدائی گوارا نہ تھی ۔

نقل - ایک دفعہ رات کو سلمان بادشاہ کے پاس سے رخصت ہو کر چلا

اندھیرا بہت تھا۔ سونے کی لالٹین مرصع کار محفل میں رکھی تھی بادشاہ نے وہ ساتھ کر دی۔ دوسرے دن خدمتگار شاہی لالٹین لینے گیا سلمان نے یہ شعر لکھ کر بھیجے:۔

من و شمع دو دلِ سوختہ و خانہ سیاہ شمع خود سوخت بشب دوش و بزاری امروز	کہ شب او گرید و من از غم خود افروزم گر لگن میطلبد شاہ زمن مے سوزم

بادشاہ سن کر ہنسا اور لالٹین اُسی کو دے دی۔

نقل۔ ایک دن سلمان دجلۂ بغداد کے کنارے پر تیر اندازی کر رہا تھا۔ اتفاقاً درویش ناصر بخاری اپنے وطن سے حج کو جاتا تھا۔ چونکہ سلمان کا نام اور شہرۂ شاعری سُنا ہوا تھا اس لئے مشتاق ہو کر ملاقات کو آیا۔ سلمان نے وطن پوچھا اور کہا کہ کچھ شعر کا بھی شوق ہے۔ درویش نے کہا کہ یہی شوق یہاں تک لایا ہے۔ اُس وقت دریائے دجلہ بڑے زور شور سے بہ رہا تھا سلمان نے کہا ؎

دجلہ را امروز رفتارے عجب مستانہ ایست

درویش ناصر نے کہا کہ ؎

پائے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ ایست

سلمان بہت خوش ہوا اور کچھ اور اشعار کی فرمایش کی۔ درویش نے یہ غزل پڑھی:۔

غزل درویش ناصر بخاری

ما را ہوسِ صحبتِ جاں پرور یار است در مدرسہ کس را نرسد دعوے توحید	ورنہ غرض از بادہ پرستی نہ خمار است منزلگہِ مردانِ موحّد سرِ دار است

ناصر اگر از ہجر بنالد عجبے نیست
مہجور ز یار است و پریشاں ز دیار است

سلمان نے بہت تعریف اور تعظیم کی اور اپنے گھر لے جا کر چند روز مہمان رکھا۔

اور ساماں کے ساتھ رخصت کیا۔ عبید زاکانی سے جو اس کا معرکہ ہوا۔ وہ اُس کے حال میں لکھا جائیگا۔

لطیفہ۔ آخر عمر میں دنیا سے سیر ہو کر گوشہ نشین ہو گیا۔ بادشاہ نے بہت سا انعام اکرام دیا اور زمین جاگیر کے طور پر مقرر کر دی۔ رے کے علاقہ میں ایک گاؤں ایرین نام تھا کہ بہت سر سبز اور شاداب تھا۔ اور چشمے آب رواں کے اُس میں جاری تھے اُس کے لئے درخواست کی شاہ نے عرضی پر یہ شعر لکھا ؎

دہِ ایرین کہ از حدودِ رے است	بدھیدش کہ التماسِ وے است

مولانا جامی بہارستان میں اس کی بہت تعریف لکھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ سرقہ کرتا تھا اور خصوصاً کمال اسمٰعیل کی چوری بہت کرتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ سلمان کے کلام میں چند باتیں خاص ہیں۔ اوّل یہ کہ فصیح اور صاف ہے۔ دوسرے اُس میں صنائع و بدائع اس طرح سہل ممتنع ہو کر بے تکلف آتے ہیں کہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا۔ تیسرے کلام عاشقانہ و رنگین زیادہ تر کہتا ہے۔ مگر کلیات اُس کا ایسا ہے کہ طلبگار شایق کو اُس سے ہر قسم کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ ۷۶۹ھ ہجری میں جہان فانی سے طرف عالمِ جاودانی کے کوچ کیا۔ زورِ کلام اُس کا اس قصیدہ سے واضح ہوتا ہے جس کے چند شعر انتخابی یہ ہیں :-

قصیدہ

سقی اللہ لیلا کصدغی الکواعب	شبے عنبرین خال و مشکیں ذوائب
ہوا را بگوھر مُرصع حواشی	زمیں را بعنبر مُسَتَّر جوانب
درفشِ بنفش سیاہ حبش را	رواں در رکاب از کواکب مواکب

بر آراستہ گردن و گوش گردوں
شب از گوہرِ شب چراغِ کواکب

ایک مقام پر دلشاد خاتون کی تعریف کے قصیدے میں کہتا ہے ؎

ہزار بار ز نخوت شکستہ از سرِ تمکیں ‌ ‌ شکوہ مقنعۂ او کلاہ گوشۂ سنجر

متفرّق اشعار اُس کے بنظر اختصار انتخاباً لکھے جاتے ہیں ؎

معنیٔ نیک بود شاہدِ پاکیزہ بدن ‌ ‌ کہ بہر چند در و جامہ دگرگوں پوشند
کسوتِ عار بود و باز پسیں خلعتِ او ‌ ‌ گر نہ در خوبیش از بیشتر افزوں کوشند

ہنرش آنکہ کہن خرقۂ پشمیں ز برش
بدر آرندش و در اطلس و اکسون پوشند

بادِ سحر گہی بہوائے تو جاں دہد ‌ ‌ آبِ حیات را لبِ لعلت نشاں دہد
در بوستاں بیا دِہانِ تو غنچہ را ‌ ‌ ہر دم ہزار بوسہ صبا بر دہاں دہد
زانسانکہ عکس بادہ دہد حسن روئے گل ‌ ‌ رویت بعکس حسن مہِ آسماں دہد
از حلقۂ دو زلفِ تو عطّار بادِ صبح ‌ ‌ بوئے بعالمے وہمہ رائگاں دہد
گلگونہ از جمالِ تو خواہد بعاریت ‌ ‌ بادِ صبا چو عرض گل و گلستاں دہد
تا چند در ہوائے جمالت بآب چشم ‌ ‌ بر چہرہ لالہ کارم و برزعفراں دہد
ما بیدلیم و راہِ غمت پر خطر بگوئے ‌ ‌ با زلف پر دلت کہ دلِ بیدلاں دہد
ہر ناوک بلاکہ کشاید قضا ز چرخ ‌ ‌ چشمِ راستش ہدف بدل نشاں دہد
گردد ببینہ لبِ من چشمۂ حیات ‌ ‌ ہر گہ کہ شرح آں لبِ شکّر فشاں دہد
دریائے جود شاہ اویس آنکہ دولتش ‌ ‌ نوشِ رواں بقالبِ نوشیرواں دہد
برقامتِ بزرگیِ او اطلسِ فلک ‌ ‌ مینر بیداز بزرگیِ او تن وراں دہد
یکروزہ وجہ خرچ دل و دستِ او بود ‌ ‌ ہر در کہ بحر بخشد و ہر زر کہ کاں دہد
برروے رانِ آہو اگر داغِ او نہند ‌ ‌ بس بوسہا کہ شیر زرحمت براں دہد
اے سرورے کہ راے تو در ضبطِ مملکت ‌ ‌ ہر دم خجالتِ خرد خوردہ داں دہد
چوں پیرِ چرخ طلعتِ بختِ ترا بدید ‌ ‌ گفت ار مرا مدد دہد ایں نوجواں دہد

هست آستانت حضرتِ اقبال را حرم ‌‌ ‌ مقبل کسیکه بوسه بر آں آستاں دهد
روحِ ظهیر اگر شنود این قصیده را ‌ ‌ صد بار بیش بوسه مرا بر دهاں دهد
تا صبح نوعروس زمرّد حجاب را ‌ ‌ هر روز جلوه از تتقِ خاوراں دهد

بادا عروس بخت ترا زینتے که چرخ
هر ساعتش بروے نما صد جهاں دهد

ابیات در وصف دارالسّلام

اے قبلۂ سعادت و وے کعبۂ صفا ‌ ‌ جاے خوشی و نیست نظیر تو هیچ جا
هر طاق از رواق تو چرخ زمیں ثبات ‌ ‌ هر خشت از اساس تو جام جهاں نما
در ساحتِ تو مروحه جنباں بود شمال ‌ ‌ در مجلس تو مجمره گرداں بود صبا
چوں روضۂ بهشت زمین تو روح بخش ‌ ‌ چوں چشمۂ حیات هوائے تو جاں فزا
بازار خور چو سایۂ او سرد در تموز ‌ ‌ پشت زمیں به پشتی او گرم در شتا
بنداد سایه بر سرِ آفاق ازاں فگند ‌ ‌ کافگند سایه بر سرِ او سایۂ خدا
از چرخ دوخت بر قدِ قدرش قبائے قدر ‌ ‌ لیکن نداد هست او تن دراں قبا

طاس زمانه را همه صیتش بود طنیں
کاخ زمانه را همه شکرش بود صدا

تا برنخیزی از سرِ دنیا و هر چه هست ‌ ‌ با یار خویشتن نتوانی و مے نشست
خواهی که سربلند شوی در هوا چو گرد ‌ ‌ سلماں چو خاک در قدم دوست کردن ست

سر کوبش هوس داری هوس را پشت پائے زن ‌ ‌ دریں اندیشه یکرو شو و دو عالم را قفائے زن
مرا تیر تو سخت آمد که بر بیگانگاں آمد ‌ ‌ چو زخمے میزنی بارے بیا بر آشنائے زن

فراق روے تو از شرح و بسط بیرون است ‌ ‌ زما مپرس که حالِ درونِ او چوں ست

نے کنم سخن اشتیاق کاں تقریر | زظرف حدّ و زحدِّ عبارت افزون ست

دل دید خواست تا بسر دخوں گرفتہ بود | جاں خواست خواستم بدہم غم ستاندہ بود

رباعی

برزلف تو چوں بادو زیدن گیرد | از ہر طرفے مشک دمیدن گیرد
چوں درلبت اندیشۂ باریک کنم | خوں ازلب اندیشہ چکیدن گیرد

رباعی

ازبسکہ شکست باز بستم توبہ | فریاد ہمیکند ز دستم توبہ
دیروز بتوبۂ شکستم ساغر | امروز بساغرے شکستم توبہ

برعارضِ گلرنگ تو اسے بدرمنیر | چوگاں گویم زلف ترا یا زنجیر

رباعی

آمد سحرے ندا زمیخانۂ ما | کاسے رند خراباتیٔ دیوانۂ ما
برخیز کہ پرکنم پیمانہ زمے | زاں پیش کہ پُرکنند پیمانۂ ما

رباعی

اے آنکہ تو طالبِ خدائی بخدا | از خود بطلب کز تو جدا نیست خدا
اوّل بخود آ چوں بخود آئی بخدا | اقرار نمائی بخدائی خدا

صنما مژدۂ آنم کہ تو جانم باشی | میدہم جاں کہ مگر جان جہانم باشی
روزِ عمرِ من مسکین بشب آمد تا تو | روشنائیٔ دل و شمعِ روانم باشی
بارِ گردون و غم ہر دو جہان بدلِ من | زنگراں باشد اگر تو نگرانم باشی
تو سراپا ہمہ آنی و ہمہ آنِ تو اند | غرضِ من ہمگیں آں کہ تو آنم باشی

غزل

مسکین دلِ من گم شد و من در طلبِ وے
بُردم بگمان خانۂ ابروے تو اش پے

خامند کسانیکہ بداغت نرسیدند
من سوختۂ آنکہ بمن کے رسد آں کے

صد بار مئے لعل توام جاں بلب آورد
اے دوست بکامم برساں یکدم ازاں مے

مُطرب بزن آں سازِ جگر سوز دمادم
ساقی بدہ آں جامِ دل افروز پیاپے

در شرحِ فراقِ تو سخن را چہ دہم بسط
شرطِ ادب است آنکہ من ایں نامہ کنم طے

بے رویت اگر دیدہ بخورشید کنم باز
صد بار کند چشمِ من از شرم رخت خوے

سلماں رہِ سودائے تو میرفت غمت گفت
کیں راہ بپای چو توئی نیست مرو ہے

رشیدُ الدّین محمّد وطواط

رشیدالدّین محمد نام رشید تخلّص۔ بلخی تھا مگر خوارزم میں رہتا تھا۔ باپ اس کا عبدالجلیل کاتب تھا اور دربارِ شاہی میں صاحبِ خدمت اور باعزّت تھا۔ نسب کا سلسلہ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ ابن الخطّاب سے ملتا ہے۔ اس شاعر کا کلام دیکھنے سے نہایت تعجّب آتا ہے کہ خاقانی و انوری و سعدی وغیرہ کیونکر مشہور ہوگئے اور یہ شخص کیونکر گمنام رہ گیا۔ شعرائے متقدمین میں سے ہے اور کمالِ فنّ شاعری کا اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ تذکروں کے ملاحظہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فقط شاعر ہی نہ تھا بلکہ فنّ شعر میں اور جو جو فنون کہ شعر سے متعلّق ہیں اُن میں صاحبِ تصنیف تھا اور مہارت بھی کامل رکھتا تھا۔ چنانچہ حدائق السحر نام ایک کتاب اُس کی تصنیف ہے کہ اگرچہ اب نہیں پائی جاتی مگر

ہر کتاب میں سنداً اور فخریۃً اُس کا ذکر دیکھا جاتا ہے - خصوصاً ابتدا میں ایسی کتاب کا تصنیف ہونا نہایت قابل لحاظ کے ہے - باوجود اس کے خیالات اُس کے سیدھے سیدھے ہیں بلکہ اکثر حکیمانہ ہیں اور طرز کلام بھی صاف اور قدیمانہ۔ طبیعت اس کی نہایت تیز طرّار تھی اور ذہن شوخ اور چالاک - ہمیشہ شعرا و علما کو دھمکاتا رہتا تھا اور تقریر کا یہ عالم تھا کہ کوئی اس کے آگے دم نہ مار سکتا تھا۔ اس سبب سے لوگ اس سے جلتے تھے اور ایسی ایسی فاحش اور غلیظ ہجویں کہتے تھے کہ جن کا لکھنا بھی یہاں مناسب نہیں - اور چونکہ چھوٹا سا آدمی تھا اور ساتھ اس کے صورت بھی کالی کلوٹی بدشکل تھی اس لئے لوگوں نے اس کا نام وطواط رکھ دیا تھا - وطواط ابابیل کو کہتے ہیں ؀

لطیفہ - ایک دن خوارزم شاہ کے دربار میں پہنچا اور علماے دربار سے گفتگو شروع کر کے اس زور شور سے اور طمطراق سے تقریریں کیں کہ سب کے سب دنگ رہ گئے اور بادشاہ بھی حیران ہو گیا - کچھ تو یہ شوخی اور بے باکی اس کی ناگوار بھی گذری اور کچھ طبیعت میں ظرافت آئی کہ ایسا چھوٹا سا آدمی اور یہ زبان درازی - غرض رشید سامنے بیٹھا تھا اور بیچ میں ایک دوات رکھی تھی - بادشاہ نے کہا کہ ذرا اس دوات کو ہٹاؤ تا کہ دکھائی دے کہ اس کے پیچھے یہ کون بول رہا ہے - رشید کو بُرا معلوم ہوا اور اُٹھ کر دربار سے چلا گیا - لیکن چونکہ اس کے کلام اور کمال میں بادشاہ کو بھی کچھ کلام نہ تھا اس لئے پھر بُلایا اور بہت سا انعام و اکرام دیکر دربار میں رکھا؀ سالہا سال تک صاحب دیوان رہا اور خدمتہاے عالی سر انجام کرتا رہا۔ بسبب اس کے کمال کے دُور دُور کے لوگ اپنا کلام اسے دکھانے لاتے تھے اور اصلاح لیتے تھے ؀

رشید ایک زمانہ میں اتسز کے دربار میں تھا اور وہ اس کی بہت

خاطر کرتا تھا۔ مگر اتسز مذکور سلطان سنجر کی طرف سے قلعۂ ہزار اسپ وغیرہ کا حاکم تھا۔ لوگوں نے سنجر کو اتسز کی طرف سے بدگمان کر دیا۔ سنجر خود فوج لے کر چڑھ آیا اور اتسز کو قلعہ میں محصور ہونا پڑا۔ سنجر کے ساتھ انوری شاعر بھی تھا۔ انوری نے یہ رباعی کہی اور سنجر کے سپاہیوں نے اُسے لکھ کر ایک تیر میں باندھا اور قلعہ میں پھینک دیا:

رباعیٔ انوری

اے شاہ ہمہ ملک جہاں حسب تراست	واز دولت و اقبال جہاں کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر	فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

یہ رباعی اتسز کے پاس آئی۔ رشید بھی موجود تھا اُس نے اُس کے جواب میں رباعی کہی جس کا ایک شعر یہ ہے:۔

رشید

گر خصم تو اے شاہ بود رستم گرد	یک خر ز ہزار اسپ نتواند برد

اور اس شعر کو لکھ کر تیر میں باندھا اور پھینک دیا۔ لوگ سنجر کے پاس لے پہنچے سنجر دیکھ کر بہت خفا ہوا اور عہد کیا کہ جب قلعہ فتح ہو تو رشید کو پکڑ کر سات ٹکڑے کرونگا۔ اتفاقاً قلعہ فتح ہوا اور رشید گرفتار ہوا۔ مگر منتخب الدین کاتب مالک دیوان شاہی صاحب علم اور صاحب کمال تھا اور سنجر کی سرکار میں بڑا صاحب اختیار تھا۔ رشید نے اُس کے پاس پیغام بھیجا کہ زمانہ کے اتفاق سے یہ واقعہ پیش آیا ہے اور ہم تم ہم پیشہ بھائی ہیں۔ یہ موقع رفاقت کا ہے۔ وقت نکل جائیگا اور بات رہ جائیگی۔ غرض جب سنجر کا حکم منتخب الدین کے نام پہنچا کہ بموجب ہمارے عہد کے وطواط کے سات ٹکڑے کرو۔ تو وہ خود حاضر ہوا اور عرض کی کہ قبلۂ عالم حضور جانتے ہیں کہ وطواط بہت چھوٹا سا جانور ہے اس کے سات ٹکڑے ہو نہیں سکتے غلام مجبور ہے۔

بادشاہ ہنسنے لگا اور کہا کہ اس کمبخت مرغ کے اگر دو ٹکڑے ہو گئے تو کیا ہو گئے۔ بعد اس کے اُس نے عرض کی کہ صاحب کمال ہے اور شاہانِ وقت اُس کی آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارے دربار میں ہو۔ حضور کی تلوار اس کے خون سے آلودہ ہو نہایت شرم اور بدنامی کی بات ہے۔ اس وقت تباہ ہے اور خانہ برباد ہے۔ لازمۂ بادشاہی اور موقعِ وقت یہ ہے کہ حضور اُسے خود ساز و سامانِ لائق دے کر رخصت فرمادیں۔ بادشاہ کا دل بھی پہلے ارادہ سے پھر گیا اور رشید کی جان بخشی ہو گئی۔

رشید کو خوارزم شاہ بہت اعزاز و اکرام سے رکھتا تھا اور نہایت محبت کرتا تھا۔ چنانچہ لطیفہ۔ رشید کی صورت شکل تو جو کچھ تھی سو تھی ساتھ اُسکے گنجہ بھی تھا اور وہ بھی ایسا کہ سر بالکل صفاچٹ تھا۔ بال کا نام نہ تھا لوگ اس لئے اُس کو اقرع کہتے تھے۔ سلطان نے بھی سُنا اور سُن کر یہ رباعی کہی

رباعی خوارزم شاہ کی رشید کی دلداری میں

از فضل سرت بہ آسماں مے ساید ۔۔۔ زاں بر سر تو موئے ہمے بر ناید
مارا سر تو چو دیدہ در سے باید ۔۔۔ بر دیدہ اگر موئے نباشد شاید

رشید نے خوارزم شاہ کی شان میں بڑے بڑے قصیدے لکھے ہیں۔ اور اُس کی تعریف میں اپنا ذکر اس خوبصورتی سے کرتا ہے کہ نہایت لطف حاصل ہوتا ہے چنانچہ اُسی کی تعریف میں یہ قصیدہ ہے:-

قصیدہ

شاہا بپائگاہ تو کیواں نمی رسد ۔۔۔ درساحت تو گنبدِ گرداں نمی رسد
جائے رسیدۂ بمعالی و منقبت ۔۔۔ کانجا بجہد فکرت انساں نمی رسد
جز امر تو بمشرق و مغرب نمی رود ۔۔۔ جز حکم تو بتازی و دہقاں نمی رسد
یک خطہ نیست در ہمہ آفاق و خافقین ۔۔۔ کانجا ز بارگاہ تو فرماں نمی رسد

فریاد زین جہاں کہ خردمند را ازو
بہرہ بجز نوائب و حرماں نمی‌رسد

جاہل بمسند اندر و عالم برونِ در
جوید بحیلہ راہ و بدرباں نمی‌رسد

آزردہ شد بحرص درم جانِ عالماں
وین خواری از گزاف بدیشاں نمی‌رسد

دردا و حسرتا کہ بپایاں رسید عمر
وین حرص مردہ ریگ بپایاں نمی‌رسد

منت خدای را کہ مرا در پناہِ تو
آسیب حادثہ بدل و جاں نمی‌رسد

تا دامن جلال تو بگرفتہ‌ام مرا
دستِ بلا بریش و گریباں نمی‌رسد

یک روز نیست کز تو ہزاراں ہزار نوع
در حق من کرامت و احساں نمی‌رسد

آنم کہ چوں بر اسپ فصاحت شوم سوار
در گرد من فصاحتِ سحباں نمی‌رسد

از نظم من بخاک خراساں خزانہاست
گر شخص من بخاک خراساں نمی‌رسد

بگذار ماہ روزہ بطاعت کہ دشمنت
چوں بگذرد نہ روزہ بقرباں نمی‌رسد

نقل۔ جب خاقانی کا شہرہ بہت عالمگیر ہوا تو رشید نے بھی اُس کے اشعار سُنے اور خوش ہوا چنانچہ ایک قطعہ اُس کی تعریف میں کہہ کر بھیجا ؎

اے سپہر قدر را خورشید و ماہ
وے سپہر فضل را دستور و شاہ

افضل الدین بوالفضائل آنکہ بود
فیلسوفِ دین فزائے کفر کاہ

خاقانی نے اُس کے جواب میں لکھ کر بھیجا ؎

اگر بساحتِ گیتی نماند بوئے وفا
گر ہیچ انس نیاید ز ہیچ جنس مرا

فسردگاں را ہمدم چگونہ بر سازم
فسردگاں ز کجا و دمِ صفا ز کجا

مرا بفرقتِ پیوستگاں چناں رنجیست
کہ بس نماند کہ باشم ز سایہ نیز جدا

اگر مرا ز ندا ارجعی رسد امروز
وگر بشارتِ لا تقنطوا رسد فردا

صفیرِ صلصل و لحن چکاوک ارسازی
نفیر فاختہ و نغمۂ ہزار آوا

نوازشِ لب جانا بشعر خاقانی
گذارشِ دمِ قمری ز پردۂ عنقا

مرا ازیں ہمہ اصوات آں خوشی نرسد	کہ از دیار عزیزے رسد سلام وفا
چنانچہ دوشم بے زحمت کبوتر و پیک	رسید نامۂ صدر جہاں بدست صبا
سزد کہ عید کنم در جہاں بفخر رشید	کہ نظم و نثرش عید مؤید است مرا
اگر بکوہ رسید ے روایت سخنش	زہے رشید جواب آورے بجائے صدا
برائے رنج دل و عیش بدگوارم ساخت	جوارشے ز تحیت مفرح ز ثنا

طویلۂ سخنش سی و یک جواہر داشت	بیکیک مردم فراغ روزی افتد

کہتے ہیں کہ فن معما میں اُس سے پہلے کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی تھی۔ پہلی کتاب اس فن میں اُسی نے لکھی ہے۔ اُس سے پہلے کسی نے قصیدہ ایسا نہیں کہا کہ جس کے سب اشعار مرصّع ہوں مگر رشید نے اکثر قصیدے ایسے لکھے ہیں کہ ہر ایک مطلع سے مقطع تک مرصع ہے بلکہ اکثر قصیدے عربی میں بھی ہیں۔ اس کا کل دیوان پندرہ ہزار بیت کا ہے۔ صنعت مرصع میں ایک قصیدہ ہے :-

قصیدہ

اے منوّر بتو نجوم جمال	وے مقرر بتو رسوم کمال
حضرت تو معوّل دولت	ساحت تو مقبّل اقبال

رشید نے بڑی عمر پائی اسی واسطے بہت سی سلطنتوں کے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ اتسنر کے وقت سے سلطان شاہ اس کے پوتے کی تخت نشینی تک زندہ تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اپنے خاندان کے اس قدیمی مدّاح کو بلایا۔ رشید بہت ضعیف ہو گیا تھا اور چلنا کیا کہ اُٹھ بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ ایک چوپہلے میں بٹھا کر اسے لائے اور بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ شاہ اور تمام اہل دربار کو اور اپنی اس بے طاقتی کو دیکھ کر وہ اپنے زور شور طبیعت کے اور دربار کے مناظرے اور مباحثے یاد آ گئے کچھ دیر

تک خاموش رہا بعد اس کے یہ رباعی پڑھی :-

رباعی

جدّت ورقِ زمانہ از ظلم بشست
ای بر تو قبای سلطنت آمدہ چست
عدلِ پدرت شکستگی کرد درست
ہاں تا چہ کنی کہ نوبتِ دولتِ تست

جب انتسز مرا ہے تو رشید لباس ماتم پہنے ہوئے اور نیلا عمامہ باندھے ہوئے زار زار روتا تھا اور تابوت کے آگے آگے یہ رباعی پڑھتا جاتا تھا :-

رباعی

شاہا فلک از سیاستت میلرزید
صاحب نظرے کجاست تا درنگرد
پیش تو بطبع بندگی مے ورزید
تا آں ہمہ سلطنت بدیں مے ارزید

آخر ۹۷ برس کی عمر میں ۵۷۸ھ ہجری میں دنیا سے انتقال کیا ٭

تفصیل اس کی تصنیف کی یہ ہے ۔ حدائق السحر معانی و بیان وغیرہ صنائع شعری میں ۔ رسالہ علم معما میں ۔ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کے سو کلموں کا ترجمہ نظم میں ٭

عبید زاکانی

عبید زاکانی ہجو اور ہزل میں نہایت مشہور شاعر ہے - ایسا فحش واہیات کہتا ہے کہ جسے کوئی اشراف لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے - مگر باوجود اس کے جو کلام کہ اس روسیاہی سے پاک ہے وہ ایسا صاف اور نمکین ہے کہ شربت خضر کی لذت رکھتا ہے - زاکان ایک قصبہ کا نام ہے کہ قزوین کے علاقہ میں ہے یہ اصل میں وہیں کا رہنے والا تھا اس لئے زاکانی مشہور تھا - ابتدائے حال میں علوم درسیہ کو بڑے شوق سے حاصل کیا اور اس میں کمال کو پہنچا - گذران اچھی طرح نہ ہوتی تھی اس لئے چند روز تک بہت محنت کی اور مصیبت سختی و تنگدستی کی اٹھا کر علم معانی و بیان میں کتاب تصنیف کی - قدردانی اور صلہ کی اُمید پہ خوشی خوشی بادشاہ کے پاس لے چلا - جب دروازہ پر پہنچا تو وہاں دعا بھی قبول نہ ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس وقت بادشاہ کے پاس کوئی مسخرہ ہے اُسکے ساتھ گرم اختلاط ہیں کسی کو بار نہیں ہے - عبید کو بہت بُرا معلوم ہوا اور خیال کیا کہ جب جاہ و دولت اور بادشاہوں کی قربت میں کمال کا کام نہیں - پھر راتوں کو جاگنا اور خون جگر کھا کر عیش و آرام کو اپنی جان پر حرام کرنے سے کیا حاصل ؟ وہیں سے اُلٹا پھرا اور یہ رباعی کہی - رباعی :-

در علم و ہنر مشو چو من صاحب فن	تا نزد عزیزاں نہ شوی خوار چو من
خواہی کہ شوی قبول ارباب زمن	کنگ آور و کنگری کن و کنگرہ زن

اور اُسی وقت سے ہزل اور ہجو میں پڑ کر ایسا واہیات بکنا شروع کیا کہ جس کی کچھ حد نہ رہی چونکہ اہل زمانہ صاحب فہم اور صلاحیت اور نیکی کے قدردان کم

ہیں اور ہیں تو خاص خاص لوگ ہیں۔ برخلاف ہزل اور تمسخر کے کہ ایسی باتوں کو جاہل و عالم سب سمجھتے ہیں اور قدردان بھی بہت ہیں اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں چرچا ہو کر عالم میں مشہور ہو گیا اور یار لوگ ہاتھوں ہاتھ بادشاہ تک لے پہنچے۔ ایک مرد معقول نے اسے سمجھایا اور کہا کہ فضل و کمال کو حاصل کر کے پھر اُسے ہاتھ سے کھونا اور فضائل و کمالات سے رذائل و خرابات میں پڑنا کیا مناسب ہے۔ اس سے باز آؤ۔ اُس نے اپنی ساری سرگزشت اوّل سے آخر تک بیان کی اور کہا کہ بھائی بادشاہوں کی خدمت امیروں کی صحبت۔ دُنیا کی عیش و عشرت جب اس میں میسّر ہو تو کس کی بلا کو غرض ہے کہ کتاب میں جان کھپائے اور خون جگر کھا کر لطیف دماغ کو مدرسہ کے کثیف چراغ سے دھواں دھار کرے اور یہ قطعہ پڑھا ؎

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم	کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رَو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز	تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

مگر پھر کہتا ہے

تتمہ

نے نے کہ کنا بے دوا تنے بر عاقل	بہتر ز دو صد مملکت کام روانی
گر بے خرداں زینت این ملک شد اند	اے عقل خجل میشم از تو کہ تو دانی
فرعونِ عذاب ابد و ریش مرصّع	موسیٰ و کلیم اللہ و چوبی و شبانی

لوگوں کی ہجوؤں اور واہیات ہزلیات میں رسالے اور مثنویاں اور قصیدے ایسے ایسے لکھے ہیں کہ انسان پڑھتے ہوئے بھی شرماتا ہے باوجود اسکے فصاحت لفظی اور الفاظ کی خوبی اور صفائی نظم کی اور چستی بندش اور ترکیب کی ایسی ہے کہ دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہے۔ اسی زمانہ میں جہان خاتون ایک عورت موزوں طبع اور لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھی چنانچہ اُس کا شعر ہے ؎

مصوّریست کہ صورت ز آب میسازد	ز ذرّہ ذرّہ خاک آفتاب مے سازد

عبید کے اور اُس کے بہت جواب سوال ہیں مگر ایسے ہیں کہ کتابوں میں لکھنے کے قابل نہیں تو بھی کچھ نہ کچھ نمک چشی کے لئے لکھنا ضرور ہے کہ مذاق اہل ذوق کا محروم نہ رہے ۔

حکایت

جہان خاتون کے حسن و جمال اور طبیعت کے کمال کا جب شہرہ ہوا تو شاہ ابو اسحاق بادشاہ وقت تھا اُس کے وزیر امین الدین نے اُس سے نکاح کر لیا۔ پس اس موقع پر جس طرح شاعر لوگ جہان کی بے وفائی اور زمانہ کی ستم اجرائی میں اشعار کہتے ہیں اسی طرح عبید بھی کہتا ہے مگر چونکہ جہان خاتون اُس کا نام ہے اس لئے اشارہ وہی ہے ؎

وزیرا جہاں قحبۂ بے وفاست	ترا از چنیں قحبۂ ننگ نیست
. . . .	خدائے جہاں را جہاں ننگ نیست

خواجہ سلمان ساوجی نے مختلف لوگوں کی ہجو میں اس کے شعر سُن کر کہا ؎

جہنمیؔ ہجا گو عبید زاکانی	مقرراست بہ بیدولتی و بیدینی
اگرچہ نیست ز قزوین و روستا زادست	ولیک میشود اندر حدیث قزوینی

قزوینی اصطلاح میں جھوٹے مفتری کو کہتے ہیں ۔

عبید نے جب یہ قطعہ سُنا تو بہت خفا ہوا اور سفر کر کے گیا سلمان شان و شوکت امیرانہ سے دریائے دجلہ کے کنارے پر خیمے ڈالے پڑا تھا۔ اتفاقاً اُس وقت دریا کی سیر کر رہا تھا کہ عبید پیادہ پا پہنچا سلمان نے اُس کی وضع اور انداز سے معلوم کیا کہ کوئی آدمی صاحب کمال ہے مگر گردش زمانہ کا مارا ہوا ہے - پوچھا کہ بھائی کہاں سے آنا ہوا؟ اُس نے کہا کہ قزوین سے - سلمان نے کہا کہ قزوین میں سلمان کا نام تم نے سُنا تھا - عبید نے کہا کہ ہاں شاعر ہے - سلمان نے کہا کہ کوئی شعر اُس کا بھی وہاں پہنچا - عبید

نے کہا کہ ہاں اکثر شعر اُس کے مشہور ہیں ۔ ایک قطعہ مجھے بھی یاد ہے اور یہ پڑھا ؎

من خراباتیم و بادہ پرست	در خراباتِ مغاں عاشقِ مست
مے کشندم چو سبو دوش بدوش	مے برندم چو قدح دست بدست

بعد اس کے کہا کہ سلمان تو بڑا صاحب کمال اور بزرگ مشہور ہے ۔ اس کلام کا مضمون اُس کا نہیں معلوم ہوتا اُس کی جورو کا ہوگا کہ یہ واردات اُسی کی معلوم ہوتی ہے ۔ خواجہ کو بہت بُرا معلوم ہوا اور سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ عبید زاکانی ہے ۔ غرض بہت تکرار اور قسموں کے بعد عبید نے بھی اقرار کیا ۔ مگر بہت خفا ہوا اور کہا کہ بے واسطہ اور بے خبر اور بے سبب کسی کی ہجو کرنی نہایت بُری بات ہے ۔ تم نے وہ قطعہ جو میرے باب میں کہا کیا سمجھ کر کہا ۔ میں بغداد میں خاص تمہاری ہی نیت کرکے آیا تھا ۔ قسمت تمہاری اچھی تھی جو تم میری تیغ زبان سے بچ گئے ۔ نہیں تو ایسی سزا دیتا کہ قیامت تک یادگار رہتی ۔ خواجہ نے بہت عذر معذرت کی ۔ گھر میں لاکر چند روز مہمان رکھا اور نقد جنس تحفہ تحائف سے رضامند و خورسند کرکے رخصت کیا ۔ اشعار اُس کے کہ اکثر ہزل اور فحش سے آلودہ ہیں ۔ بہت احتیاط سے انتخاب کرکے لکھے جاتے ہیں ؎ :-

رسمیست عشق را کہ بجرمِ ملاطفت	در قیدِ حکمِ خویشتن آرد عبید را
وانگاہ بزم را بطرازد بقتلِ شاں	چوں حاجیاں بکشتنِ اضحیہ عید را

سب سے زیادہ دلنشین غزل یہ ہے :-

افتاد بازم در سر ہوائے	دل بازدارد میلے بجائے
او شہریارے من خاکسارے	او پادشاہے من بے نوائے
بالا بلندے گیسو کمندے	سلطان حسین فرماں روائے

ابرو کمانے نازک میانے	نا مہربانے شنگے دغائے
زیں دلنوازے زیں سرو نازے	زیں جو فروشے گندم نمائے
دارد شکایت ہر کس ز دشمن	ما را شکایت از آشنائے

چشم عبید ار سبزش نبیند
دیگر نبیند چشمش بلائے

اُس کی سنجیدہ نظموں میں شیراز کی تعریف نمایاں ہے مثلاً :-

بیمن معدلتِ پادشاہِ بندہ نواز	بہشت روے زمین است خطۂ شیراز

دیگر (جس وقت شیراز سے رخصت ہوتا ہے) :-

رفتم از خطۂ شیراز و بجاں در خطرم	وہ کزیں رفتنِ ناچار چہ خونیں جگرم

وہ سُنّی المذہب تھا جیسا کہ نبی کریم اور چاروں خلفا کی تعریف سے پتہ لگتا ہے۔ لیکن "ہزلیات" کے علاوہ بھی اُس کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کی اتنی خواہش یا محبت اُسکے دل میں موجود نہیں تھی۔ مثلاً :-

خدایا دارم از لطفِ تو امید	کہ ملک عیش من معمور داری
بگردانی قضائے زہد از من	بلائے توبہ از من دور داری

قرض اور مفلسی عبید کی قسمت میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ مثلاً :-

مردم بعیش خوش دل و من مبتلائے قرض	ہر کس بکار و بارے و من در بلائے قرض
قرض خدا و قرض خلائق بگردنم	آیا ادائے قرض کنم یا ادائے قرض

اگر خواجہ تربیت نکند پیش پادشاہ
مسکیں عبید چوں کند آخر ادائے قرض

نور الدین ظہوری ترشیزی

وطن اس شاعر نازک خیال کا ترشیز ہے۔ ملک دکن میں آیا اور وہیں رہا۔ اُس کی رنگیں بیانی اور نازک خیالی پر تمام اہل سخن کا اتفاق ہے کہ نظم و نثر میں لاثانی ہے۔ طرز اُس کی سب سے علیحدہ ہے اور وہ اسی کا ایجاد ہے نہ کسی نے پہلے اس ڈھنگ میں کہا۔ نہ بعد اُس کے کوئی قدم پر چل سکا۔ چھوٹے چھوٹے فقرے مقفّا لکھتا ہے۔ لیکن جس فقرے کو جس سے پیوند دیدیا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اُس کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے جاہ و حشمت کی ہوس کم تھی۔ اپنی آزادمزاجی کو بڑی نعمت سمجھتا تھا۔ اس واسطے کتابت سے گزران کرتا تھا اور اسی میں خوش رہتا تھا۔ تاریخ روضۃ الصّفا تمام و کمال کئی مرتبہ اپنے ہاتھ سے لکھی۔ اس کے جوہر کمال کے سبب سے ملک قمی[1] نے (جو ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں ملک الشعرا تھا) اپنی بیٹی سے شادی کر دی تھی۔ اُس کی سفارش سے عادل شاہ مذکور والیٔ بیجاپور کے دربار میں نوکر ہوا۔ سہ نثر ظہوری اُسی کے نام پر لکھی ہے کہ خاص و عام میں رائج ہے ؎

تا دریں مہماں سرا خوانِ خلیل آید بیاد	میزبانِ خلق ابراہیم عادل شاہ باد

لتواریخ جبکہ فیضی بحکم اکبر برہان الملک حاکم احمدنگر کے دربار میں گیا۔ وہاں سے اکبر کو لکھتا ہے (در احمدنگر دو شاعر حاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر رتبۂ عالی دارند یکے ملک قمی دیگرے ملا ظہوری)۔ ایک خط ظہوری کا جو فیضی کے

[1] واضح ہو کہ ملک قمی نے خانخاناں کی سخاوت سے بھی فیض پایا ہوا ہے اور ۱۰۲۵ھ میں فوت ہوا۔

نام تھا میں نے دیکھا اُس میں اپنے افلاس کی شکایت کرتا ہے - کیا خدا کی قدرت ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کمال کی اور اقبال کی بالکل دشمنی ہے بہت مشکل سے دونو جمع ہوتے ہیں - ایک قصیدہ مدحیہ حکیم ابوالفتح کے نام پر لکھا اُس میں بھی یہی شکایت ہے - عرفی شاعر نے اُسے ایک دوشالہ تحفہ بھیجا - شاید وہ پُرانا تھا - ظہوری نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی - رباعی

این شال کہ وصفش نہ حد تقریر است ۔۔۔ آیات رعونت مرا تفسیر است
نامش نہ کنی قماش کشمیر کہ زو ۔۔۔ صد رخنہ بکار مردم کشمیر است

نظام الملک والیٔ احمد نگر کے نام پر ساقی نامہ لکھا - گو کہ ممدوح استعداد سخن فہمی کی نہ رکھتا تھا مگر کئی ہاتھی نقد و جنس سے پُر بار بھیجے - ظہوری اُس وقت قہوہ خانہ میں بیٹھا حقہ پیتا تھا - جو لوگ انعام لے کر آئے تھے اُنہوں نے رسید مانگی - کاغذ کے پرچے پر فقط یہ الفاظ لکھ دیئے "تسلیم کردند تسلیم کردم" سبحان اللہ کمال اور قناعت اگر دونو خدا دیوے تو عجب نعمت ہے *

دیوان اس کا قصاید اور غزلیات وغیرہ انواع سخن اور مضامین بلند و باریک اور مطالب عالی سے مالامال ہے - اہل ذوق کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا - نہایت مشکل شمار کیا جاتا ہے - درس میں اسی واسطے داخل نہ ہوا ہوگا کہ بہت بڑا ہے اور کمیاب ہے - مبالغہ اس کے کلام میں بہت ہے - جو فقرہ ہے اثبات محال بلکہ محال در محال سے خالی نہیں فقط خیالات فرضی اور وہمی ہیں - سوائے تصنیفات مذکورہ کے کوئی کتاب اس کی نہیں سُنی گئی - بعض پنج رقعہ کو بھی اس کا کہتے ہیں مگر اکثر انکار کرتے ہیں - لیکن اگر اُس کا نہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کس کا ہے - مینا بازار کو بھی ناواقف لوگ مشہور کرتے ہیں کہ ظہوری کا ہے - مگر اہل تحقیق سے سُنا گیا کہ ارادت خاں واضح کا ہے - شاعری اس کی مفید خاص و عام نہیں - زبان فارسی کے محاورات

البتہ اُس سے بہت خوب حاصل ہو سکتے ہیں۔ اُس میں بھی مشکل یہ ہے کہ مضامین عام فہم نہیں۔ مصنّف کی آزاد روی اور آسودہ مزاجی میں شک نہیں کلام ہجو ہائے فحش انگیز سے پاک ہے۔ البتہ مضامین عاشقانہ و بے غرضانہ جو کچھ دل میں آتے ہیں وہ کہدیتا ہے۔ فارسی کے شایق کہا کرتے ہیں کہ ل اگر قرآن فارسی میں ہوتا تو ظہوری کی زبان پر نازل ہوتا۔ ناصر علی سرہندی کی محفل میں ایک دن ظہوری کا ذکر آیا۔ سب تعریف کر رہے تھے ناصر علی نے کہا ایسا شاعر آج تک نہیں ہوا۔ ایک شخص نے کہا کہ مولوی نظامی کا کلام ایسا ہے کہ ظہوری کی سمجھ میں بھی نہ آیا ہوگا۔ ناصر علی نے کہا کہ غلط ہے بلکہ ظہوری نے اُسے قابل سمجھنے کے بھی نہ جانا ہوگا ٭

نقل۔ ظہوری کا ایک دوست کہ وہ بھی صاحب استعداد اور سخن شناس تھا ایک دن اُس کے پاس گیا۔ ظہوری بہت دیر سے کچھ تصنیف کر رہا تھا۔ اور اس وقت نوبت انتخاب اور نظر ثانی کی تھی۔ شخص مذکور نے دیکھا کہ جو اچھّے اچھے شعر تھے اُنہیں تو کاٹتا جاتا ہے۔ اور جو چنداں قابل تعریف نہ تھے اُنہیں رکھتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس شخص نے آگاہ کیا تو ظہوری نے اس کو بھی اُس وقت شریک مصلحت کیا۔ اس سے دو باتیں حاصل ہوئیں۔ **اوّل** یہ کہ شطرنج کھیلنے والے کی نسبت دیکھنے والے کو زیادہ چال سوجھتی ہے۔ یعنی دیکھنے والے کو کام کا حسن و قبح زیادہ معلوم ہوتا ہے ٭

دوسرے یہ کہ بعض دفعہ صاحب تصنیف کی طبیعت لکھتے لکھتے ایسی ق ہوجاتی ہے کہ اپنے کلام کا حسن و قبح اسے خود نہیں معلوم ہوتا۔ پس مصنّف کو چاہئے کہ ایسے وقت پر تھوڑی دیر ٹھیر جائے۔ جب طبیعت حاضر ہو تو پھر مصروف ہو۔ غرض وہ صاحب فضل و کمال ۱۰۲۵ھ میں فوت ہوا۔ آؔ و سر اہل سخن بود مادۂ تاریخ اُس کا ہے۔ خوشگو کہتا ہے کہ مثنوی منبع الانہار اور حدیقہ بھی اُس کی تصنیف ہے ٭

ملک الشعرا طالب آملی

اس شاعر موزوں طبع رنگیں مزاج کا حال و دستگاہ علوم و فنون تفصیل کے ساتھ کسی کتاب میں نظر نہیں آتا۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی رسم کے مطابق علوم مروّجہ ابتدائی سن میں حاصل کرلئے تھے۔ مگر طبیعت ان کے قابل نہ تھی یا وہ علوم مادرزاد شاعر کے مزاج کے موافق نہ ہوئے۔ اس لئے شاعری ہی ذریعۂ عزّت ٹھیری۔ ورنہ اگر طالب کے قول پر اعتبار کرلیا جائے تو خود اپنے بچپن کے تحصیل علم کے متعلق ایک قصیدے میں لکھتا ہے ؎

پا بردہ بین پایہ اوج عشر اتم ۔۔۔ وانیک عدد فہم از آلات زیاد است

بر ہندسی و منطقی و ہیئت و حکمت ۔۔۔ دستے است مراکش ید بیضا ز عباد است

وین جملہ چو طے شد بکیں علم حقیقت ۔۔۔ کاستاد علوم است بریں جملہ مراد است

در سلسلۂ وصف خط این بس کہ ز کلکم ۔۔۔ ہر نقطہ سویدائے دل اہل سواد است

پوشم نسب شعر چو دانم کہ تو دانی
کایں پایہ مرا تا من ایں سبع شداد است

علاقۂ ماژندران میں آمل ایک معمولی شہر ہے۔ طالب وہیں کا رہنے والا تھا۔ بزرگ بھی اس کے کچھ ایسے شہرہ آفاق نہ تھے کہ جن کے نام سے اپنی شاعری کا چہرہ چمکاتا ۔

الغرض پندرہ سولہ برس کے سن میں معمولی علوم کی تحصیل سے فارغ ہوکر دل کو شاعری پر لگایا کہ طبیعت خداداد پائی تھی۔ علوم کے زور سے

گزر کر مذاق سلیم کے ذریعے شاعری کو انتہا پر پہنچایا۔ شاعری کی ابتدائی منزلوں ہی میں رباعی۔ غزل۔ مثنوی کو چھوڑ کر قصیدے لکھنا شروع کر دیا تھا ؃

اوّل اوّل مازندران کے حاکم میر ابو القاسم کی مدح میں چند قصاید لکھے مگر وہاں ترقی اقبال کے راستے مسدود دیکھ کر کاشان میں چلا آیا۔ اس جگہ ہی اس کی شاعری نے پر پرزے نکالے۔ یہاں تک کہ جب زور کلام دل قوی دیکھا تو لدو میں آیا کہ ملکش خاں شاہ عباس صفوی کی طرف سے یہاں حکومت کرتا تھا اس کی شان میں مدحیہ قصاید لکھے اور اپنے آپ کو اس کے دربار میں پہنچایا ؃

مگر یہاں بھی خاطر خواہ معاوضۂ سخن نہ پا کر وطن کے بہانہ سے ہندوستان کا رخ کیا اور ایک رباعی لکھ کر روے ایران کو سیاہ کر کے ادھر آگیا۔ کہ دوبارہ نہ پھرا۔

رباعی

طالب! گلِ ایں چمن بہ بستاں بگزار
بگزار کہ مے شوی پریشاں بگزار
ہندو نہ برد تحفۂ ما کس جانب ہند
بخت سیاہ خویش بہ ایران بگزار

ہندوستان میں اس وقت حسن و عشق کا متوالا شہزادہ جہانگیر کے نام سے تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھا جس کی مستانہ وار دادِ سخن نے دنیا بھر سے اہل کمال کو مہمان بلا رکھا تھا۔ تمام دربار شاعروں سے پٹا پڑا تھا۔ اس نے بھی اپنے آپ کو وہاں تک پہنچانے میں بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ پیش نہ چلی۔ اور بے سر و سامان لاہور۔ دلی۔ آگرہ وغیرہ میں مارا مارا پھرتا تھا۔ آخر پریشان ہو کر ہندوستان سے واپس پھر جانا چاہا کہ پتہ لگا غازی خاں تاری جہانگیر کی طرف سے قندھار کا گورنر ہے اور قابلیت اور دریا دلی اسکی ایران کے پیاسوں کو پہلے سیراب کر کے ادھر آنے دیتی ہے ؃

اِس کی قدر دانی نے طالب کو وہاں تک پہنچایا۔ اس نے بھی اِس نونہال کو افسردہ خاطر اور گردشِ زمانہ سے پریشان دیکھ کر دل میں جگہ دی مگر افسوس یہ اطمینان کا زمانہ آنکھ کھولتے ہی کھولتے ختم ہو گیا۔ اور غازی خاں نے سندِ آخرت سے پروانۂ صوبہ داری کو جلد تبدیل کر لیا ✤

اس ناکام کو پھر ہندوستان کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ یہاں آکر پھر اُسی چکّر میں لگ گیا کہ دربار تک رسائی نکالے۔ بہت حیران و سرگردان ہوتا ہوا آخرکار اعتمادُ الدّولہ[1] کی سرکار میں گھُس گیا۔ یہاں رہ کر اپنے زورِ کلام سے اعتمادالدّولہ کے دل میں گھر کر لیا۔ کچھ ہم وطنی نے ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ اعتمادالدولہ نے جہانگیر کے دربار میں بڑی تعریفوں کے ساتھ پیش کر ہی دیا۔ جہانگیر نے بھی اس صاحبِ کمال کو زمرۂ شعرا میں داخل کیا ✤

لیکن اور تذکروں میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے جہانگیر کے دربار میں اس کو دیانت خاں مصاحبِ خاص نے پیش کیا۔ اس سے پہلے اکثر غائبانہ جہانگیر کے سامنے طالب کی بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ جس وقت دیانت خاں نے اس کو جہانگیر کے سامنے پیش کیا اس قسمت کے مدہوش نے مفرّح[2] استعمال کیا ہوا تھا ✤

جہانگیر نے نہایت مہربانی کے ساتھ سلسلۂ گفتگو چھیڑا۔ مگر طالب بت بنا سامنے کھڑا رہا۔ کوئی جواب معقول نہ دیا۔ آخر دیانت خاں نہایت شرمسار اس کو واپس لے آیا۔ اس کے بعد اس خجالت کے مارے عرصہ تک دربار

---

[1] اعتمادُ الدّولہ۔ نورجہاں کا باپ۔ اوّل مرزا غیاث اور نورجہاں بیگم کی شادی کے بعد سے ہندوستان کی تاریخ میں اعتماد الدولہ مشہور ہے۔ یہ وزیرِ کل تھا ✤

[2] مُفرّح۔ منشی اشیا۔ مثلاً بھنگ۔ افیون۔ چرس وغیرہ میں قیمتی ادویات مشک۔ عنبر۔ زعفران وغیرہ ملا کر اس کا جوہر اُڑاتے ہیں جس کو آج بھی فلک سیر کے نام سے ہندوستان کے مزاجدار شریف استعمال کرتے ہیں

کی خواہش نہ کی۔ یہاں تک کہ اعتماد الدولہ نے زمرۂ شعرا میں داخل کرادیا ٭

دربار میں اس کی شگفتہ بیانی نے جہانگیر کو پھر اس کی طرف مائل کیا۔ اور واقعۂ مذکور کے حال سے آگاہ ہوکر اس پر زیادہ شفقت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے ملک الشعرا کر دیا۔ چنانچہ تزک میں خود بھی لکھا ہے :-

دریں تاریخ طالب آملی بخطاب ملک الشعرائی خلعت امتیاز پوشیدہ۔ اصل او از آمل است۔ یک چندے بہ اعتماد الدولہ مے بود۔ چوں رتبۂ سخنش از ہمگناں درگذشت درسلک شعرائے پایہ تخت منتظم گشت۔ ایں چند بیت ازوست ؎

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی	دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد
عشق در اوّل و آخر ہمہ جد ست و سماع	ایں شرابے ست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش ست
دو لب خواہم یکے در مے پرستی	یکے در عذر خواہی ہائے مستی
ز غارت چمنت بر بہار منّت ہاست	کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

طالب اپنی فطرتی شاعری کے ذریعے بڑے پر زور قصاید جہانگیر کی مدح میں لکھتا تھا اور ہمیشہ اس کو خوش رکھتا تھا۔ اور جس دن سے جہانگیر نے اس کو ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ اس کے ہمسر شاعر رشک و حسد کی حدود سے آگے بڑھ کر اس کی اوائل کی سرگردانی اور علوم مروّجہ میں کمی کو تودۂ ملامت بناکر ہجو کے تیر برساتے تھے ٭ (دیکھو ملا شیدا کا حال) ٭

مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنے وقت کا استاد۔ وفا شعار۔ شگفتہ مزاج اور نیک نیت شاعر تھا۔ زمانہ کی ضرورتیں کس کس کو خاک نہیں چھنواتیں۔ جہانگیر آخر عمر تک اس کے ساتھ نہایت عزّت و احترام کے ساتھ پیش آتا رہا۔ اس کے بعد طالب کو پھر کسی دروازہ کا منہ

نہ دیکھنا پڑا۔ یہاں تک جہانگیر کے عہد حکومت کے آخری سال میں عین شباب میں یہ بلبل بوستان سخن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

طالب کی شاعری کو اس کے ہمعصر بہت زیادہ وقعت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ اوّل تو وہ نووارد۔ دوسرے کم سن۔ تیسرے اس کی زندگی کا ابتدائی حصہ جو ہندوستان میں گزرا وہ ناقابل بیان تھا۔ ان سب پر غضب یہ ہوا کہ آتے ہی ملک الشعرائی کی کرسی پر ہو بیٹھا۔ یہ سب باتیں تھیں کہ اور شعرا دیکھتے تھے اور جلتے تھے۔ اور طالب کے مقام پر ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے اس کی طرف سے داد سخن کا منہ پھیر پھیر لیتے تھے۔

اس کا کلام اپنے ہمعصروں سے زیادہ لطیف اور استعاروں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ جو اس زمانے کی شاعری کا اوج سمجھنا چاہئے بعض اوقات جن کی حد طلسم کاری سے جا ملتی رہی ہے۔

مُلّا شیدا

اس شاعر نے جہانگیر کے اخیر زمانہ میں اور شاہجہاں کے ابتدا میں نام پیدا کیا۔ صاحب طبع تھا اور طبع شگفتہ اور رسا رکھتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ پُرگو تھا اور خوشگو تھا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اپنے عہد میں یگانہ تھا۔ چونکہ ساتھ کمال کے شوخ طبع حاضر جواب لطیفہ سنج بذلہ گو تھا۔ اس لئے شعرائے پایۂ تخت سب اس سے جھپکتے رہتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ملک الشعرا اور بڑے بڑے مشاقوں کا خاکہ اڑا دیتا تھا۔ طبیعت ایسی حاضر تھی کہ یاروں کے جلسہ میں بیٹھا ہنستا جاتا تھا اور رنگین اور نمکین شعر کہتا جاتا تھا۔

لطیفہ - جب ابوطالب کلیم کے بعد محمد قلی سلیم ملک الشعرا ہوا تو شیدا کہا کرتا تھا - خوشا نصیب اُن شعراے مرحوم کے جنھوں نے سلیم کی ملک الشعرائی کا بار نہ اُٹھایا ٭

لطیفہ - مراۃ الخیال میں لکھا ہے کہ شیدا کچھ شاعر نہ تھا - فتح پور کے شیخ زادوں میں سے تھا اور ایک امیر کے ملازموں میں تھا - جیسا کہ اُس زمانہ کے امرا کو عموماً شعر کا شوق تھا اس طرح اس کے آقا کو بھی تھا - اکثر شعرا اسکے ہاں آکر جمع ہوا کرتے تھے - شیدا خود نہ کہتا تھا مگر شعرا کے کلام دیکھ دیکھ کر اور سُن سن کر محظوظ ہوتا تھا اور اُن کے نکتوں کو دھیان میں رکھتا تھا - ایک دن جلسہ میں کسی نے ایک مصرع پڑھا کہ اس پہ مصرع لگانا چاہیئے جو جو شاعر موجود تھے سب ذہن لڑانے لگے کسی سے مصرع برجستہ بہم نہ پہنچا - شیدا نے بھی خیال کیا - اس کی طبیعت کام کر گئی - جب پڑھا تو سب نے پسند کیا اور آقا بھی بہت خوش ہوا بلکہ اُس دن سے زیادہ تر عنایت کی نظر ہوگئی - یہاں تک کہ رفتہ رفتہ دربار میں لے جاکر پاے تخت کے شعرا میں اسے بھی داخل کیا - اور جو ترقی کی وہ اس کے کلام سے واضح ہے - البتہ نصیبہ آگے نہ بڑھا - خیر یہ اس کی کوتاہی نہیں نصیبہ کی کوتاہی ہے - میری راے میں اس کی طبیعت کی گرمی اور کلام کی شوخی بھی مانع ترقی ہوتی رہی ہے کیونکہ ذرا ذرا سی بات پر جو بڑے بڑے لوگوں سے بگڑ بیٹھتا تھا اور چھوٹے آدمی کے چڑھانے اور آگے بڑھانے والے اوّل اوّل وہی لوگ ہوتے ہیں پس اُن کی ناراضی باعث نارسائی ہوتی رہی ٭

لطیفہ - حاجی محمد جان قدسی نے ایک قصیدہ بڑے زور شور کا لکھا ہے ؎

عالم از نالۂ من بسکہ تو چنان تنگ فضاست	کہ سپند از سر آتش نتواند برخاست

حقیقت یہ ہے کہ سرتاپا اس قصیدہ کو معانیٔ تازہ اور الفاظ برجستہ سے مُرصّع کہا ہے۔ مگر شیدا نے اوّل سے آخر تک اُس کی محنت کو برباد کردیا۔ چنانچہ بسم اللہ مطلع ہی پر کہتا ہے ؎

اے سخن سنج ہنرمند باندیشہ بسنج	نقد ہر حرف بمیزانِ خرد بےکم و کاست
نالہ در سینہ ہوا نیست کہ بے قصد رود	چونکہ در سینہ ہوا گرم شد از جنس ہواست
عالم از وے نشود تنگ ولیکن ز ملال	خلق و عالم گر از و تنگ نشینند رواست
خود گرفتم کہ جہاں تنگ شد از نالۂ تو	کہ ز تنگیٔ نظر از چشم نیاد و برخاست
نیست ترتیب دو مصراع بہم ربط پذیر	کہ سیاق سخن از ہر دو باندیشہ جداست
تنگیٔ عالمے از نالہ بکیفیت اوست	کہ جہاں تنگ ز اندوہ شدہ بر دلہاست

تنگیٔ جا ز کجا تنگیٔ اندوہ کجا
بیشتر از تن و جاں تفرقہ ہم پیداست

اور اس کا نام قطع اللسان رکھا ہے۔

لطیفہ۔ سرخوش کہتا ہے کہ ایک دفعہ شیدا نے قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ ہے ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں مُصفّا جوہرے ... حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

تمام اہلِ سخن نے پسند کیا اور خاص و عام میں مشہور ہوگیا۔ اربابِ نشاط نے ترانوں میں گایا۔ شاہ جہاں بادشاہ نے بھی سُنا۔ باوجودیکہ ایک خیال شاعرانہ تھا۔ اگر تصوّف میں بھی لے جاتا تو کچھ بات نہ تھی مگر خدا جانے بادشاہ کو کیا خیال آیا کہ سُن کر بہت خفا ہوا اور کہا کہ شراب اُمّ الخبائث جس کی حرمت قطعی قرآن سے اور ممانعت و مذمّت شریعت سے صاف ثابت اس نے اُسے یہاں تک پہنچا دیا۔ کہدو کہ ہماری قلمرو میں سے نکل جائے مگر مقربانِ دربار کی معرفت اُس نے قطعۂ مفصّلۂ ذیل کہہ کر گذرانا۔ اور

پھر بادشاہ کو اپنے حال پر مہربان کیا :-

قطعہ

جہاں پناہا شاہا بقدر جاہ و جلال
بوصف میزدہ سرازمن این دو مصرع خوش
اگرچہ لفظش عام است و معنیش خاص است
چنین کہ میکشد اسرار مولوی جامی
بوصف مے و صراحی دوبار قلقل مے
مرا بکفر چہ نسبت بود کہ زنبہ رسے
مرا چو شاہ براند کجا توانم رفت

بنا فرید خدا چوں ترا عدیل و نظیر
کہ گشت ورد زبانِ ہمہ صغیر و کبیر
بخاص و عام بود شہرہ ہمچو بدر منیر
کہ ہست گفتۂ او دور از درِ تقصیر
بہ از چہار قلش گفتہ فارغ از تکفیر
سخن چنین کند و ہیچ نامدش تقصیر
بگاہ راندن از کف کجا رود شمشیر

کنوں ز تو بہ بعذر خطا پذیرا ایم
بوصف مے نکشایم لب از رہ تقصیر

اور جامی کا قول یہ ہے :- ؎

ازصراحی دوبار قلقلِ مے
نزد جامی بہ از چہار قل است

سرخوش کہتا ہے کہ شیدا کا ایک مطلع خوب ہے ؎

بسکہ بنگاشتہ اشکم رخ کاہی ازخوں
مژہ ام بستہ بہم چوں پر ماہی ازخوں

مگر پیش مصرع اچھا نہیں پایا - چنانچہ میں کہتا ہوں ۔ سرخوش ؎:-

بسکہ میریزد سرشک ازدیدۂ گریانِ ما
بستہ ازخوں چوں پر ماہی بہم مژگانِ ما

لطیفہ - طالب آملی کہ اپنے عہد کا استاد اور جہانگیر کے شعراے پاے تخت میں تھا اُس کے حق میں بھی کہتا ہے ؎

شب و روز مخدوم ما طالبا
مگر قول پیغمبر آمد بجا

پئے جیفۂ دنیوی در تگ است
کہ دنیاست مردار و طالب سگ است

لطیفہ - مرزا امر اللہ ولد مہابت خاں خانخاناں کی ہجو میں کہتا ہے ؎

نہ تنہا من ہمیں گویم کہ امر اللہ مفعولا ۔۔۔ خدا ہم گفتہ در قرآں کہ امر اللہ مفعولاً

لطیفہ ۔ اظہری ایک شاعر آنکھوں سے نابینا تھا ۔ ایک دن جلسہ میں بیٹھا ہوا اپنی غزل سُنا رہا تھا ۔ مقطع پڑھا ۔ ؎

خواہ با اظہری و خواہ بہ بیگانہ نشیں ۔۔۔ من ہمیں شرم ترا با تو نگہباں کردم

شیدا ہنس کر بولے کہ ۔ بلے مثل ہندی مشہور است ۔ زنِ نابینا را خدا نگہبان است ۔ یعنی اندھے کی جورو کا اللہ بیلی ہے ۔

لطیفہ ۔ ایک دفعہ بادشاہ کشمیر کو گئے وہاں سے شال اور دوشالے وغیرہ پشمینہ کا بہت سا مال خزانہ میں آیا ۔ حکم ہوا کہ لوگوں کی تنخواہ جو ششماہی چڑھی ہوئی ہے چہارم حصہ اس میں شالیں دے دو ۔ جس طرح سب کو دیا اسی طرح اِن کی بھی چٹھی ہوگئی ۔ اس نے تکرار کی ۔ متصدیوں نے سمجھایا ۔ اس نے ایک نہ سُنی آخر رفتہ رفتہ خاص دیوان اعلےٰ تک نوبت پہنچی ۔ اُس نے بھی کہا کہ جو سب کو ملا ہے وہی تم کو بھی ملیگا ۔ مگر جب اس نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا تو نواب نے بساولوں کو حکم دیا ۔ اُنہوں نے سامنے سے ہٹانا چاہا اور اس کی پگڑی سر سے گر پڑی ۔ چلّا کر عرض کی ۔ نواب صاحب سلامت ایک عرض ہے ۔ برائے خدا سُن لیجئے ۔ جب پاس لے گئے تو کہا کہ یہ تو حضور کا دیوان ہے ۔ مگر ایک دیوان فدوی کا بھی ہے ۔ جو عزّت میں نے آپ کے دیوان میں پائی ہے وہی عزت آپ میرے دیوان میں پائینگے ۔ نواب ہنسنے لگا اور اُسی وقت اسکی چٹھی نقدی کی کردی ۔

لطیفہ ۔ حکیم حاذق[1] تخلّص سے کسی بات پر بگاڑ ہوگیا اُسی کی ہجو

[1] یہ حکیم حاذق بیٹا حکیم ہمام گیلانی کا جو کہ عہد اکبر میں بڑا نامی گرامی رکن دربار اور مشیر تدبیر سلطنت کا تھا یہ فتحپور سیکری میں پیدا ہوا اور جہانگیری اور شاہجہانی عہد میں سہ ہزاری درجہ تک منصب حاصل کرکے آگرہ میں گوشہ نشین ہوگیا ۔

کہدی ایک شعر اس میں کا اگرچہ فحش ہے لیکن چونکہ بات خوب نکالی ہے
اس لئے بغیر لکھے رہا نہیں جاتا اہل ادب معاف فرمائیں ؎

بر کبیر تو بیبی از تو حاذق	حاجت نشود برائے امساک

لطیفہ - میر الہی اپنے عہد کا ایک مشہور اور سلیم الطبع شاعر تھا - ایک صحبت میں اس سے باتوں ہی باتوں میں بگڑ گیا اور فی البدیہہ یہ قطعہ کہکر سُنا دیا کہ میر صاحب حیران رہ گئے اور سب لوگ ہنسنے لگے ؛

قطعہ

اے میر من کہ کردہ الہی تخلصی	از مرد لائے گرچہ الہی شدن خطاست
زیں رطب و یابسے کہ بود در کلام تو	گر منکر کلام الہی شوم رواست

میر نے بھی اس کے حق میں بہت سی رباعیاں کہ کر دل کی بھڑاس نکالی مگر حق یہ ہے کہ اُس کی تلافی نہ ہو سکی ؛

اس نے ایک مثنوی ۱۲ ہزار شعر کی مخزن اسرار کے جواب میں کہی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مضامین لطیف اور معانی دلاویز اور پند و نصائح اور لطائف رنگین سے مالا مال ہے نام اس کا دولت بیدار رکھا ؛

مطلع

آمدہ سرچشمۂ فیض عمیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

درحقیقت داد سخنوری دی ہے اور اس کا ایک ایک شعر ایک ایک کتاب ہے ؛

اشعار

اے بروے تو گردآئینہ را روے نیاز	شانہ را دست دعا در شب زلف تو دراز
گر بصحرا مو فشاند دشت پر سنبل شود	ور بدریا رُخ بشوید خار ماہی گل شود

ہواے شصت زلفت ماہی از کوثر برون آرد
شکر خند تو موج جوہر از خنجر برون آرد

ہوایت در سرے گنجد کہ در زیر دم تیغت
چو شمع از جیب خود ہر دم سر دیگر برون آرد

زلف او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل
زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

اگر گیسو برافشانی ہوا در مشک تر پیچی
وگر رخسار بنمائی شب ما در سحر پیچی

فسوں گرداند آں خاکے کہ از روے بوے یار آید
شناسم بوے زلفت را اگر در مشک تر پیچی

نہ من دود ام نہ تو بادی نہ من زلفم نہ تو شانہ
کہ چوں من بیشتر پیچم تو با من بیشتر پیچی

بدیں حسن توانگر زلف چوں دلق گدا داری
کہ گاہے سائبان رخ کنی گہ بر کمر پیچی

زہے بزلف و برخ طاعت و گناہ تمام
کہ ایں تمام بود روشن آں سیاہ تمام

من و شبے کہ نگہ دو بسال و ماہ تمام
توئی و روز وصالے بیک نگاہ تمام

نسودہ زلف سیہ طالعم چو نو مشقے
کہ نانوشتہ کند دست را سیاہ تمام

اشکم سر خون است گرہ بستہ بمژگاں
کز جور تو چشمم گزد انگشت بدنداں

از وحدت و کثرت چہ سخن گوید عارف
از دست و دہان تو کند حجت و برہاں

از روشنی و تیرگی آں عارض و گیسو
چوں صبح توانگر بود و شام غریباں

مثنوی

ستایش سراپا ستایش تراست
کہ در ہر نمودے نمایش تراست

دہد ذوق توحید تو در دہن
سخن را زبان و زباں را سخن

باندیشہ راہ تو نتواں سپرد	کہ کس تشنگی ز آب کوثر نبرد
سخن چوں ز حمد تو بندد نگار	چہ پروردہ گوید بہ پروردگار
چو چشم ارچہ خود روسیاہ آدمم	بچندیں زباں عذر خواہ آدمم

چو چشم سیہ بہتر است از سفید
بجرم از تو باشد چرا نا اُمید

میاں ناصر علی سرہندی

ناصر علی نام علی تخلص۔ اگرچہ سرہندیؔ[1] مشہور ہے جو کہ پٹیالہ کا علاقہ ہے۔ مگر درحقیقت لاہور کا رہنے والا تھا۔ چونکہ نہ خود ولایت زا تھا نہ قریب العہد ولایتی زادہ تھا۔ ہندوستانی ہونے کے سبب سے اہل تصنیف اس کو میاں ناصر علی لکھتے ہیں۔ حقیقت یہ کہ نازک خیالی اور معنی یابی میں بے عدیل تھا مگر مشکل یہ ہے کہ خیال کرتے کرتے ایسا خیال میں غرق ہوا ہے کہ بعض جگہ بالکل شیخ خیالی ہوگیا ہے اور اکثر معنی کی تلاش میں ایسا ڈوبا ہے کہ بے معنی ہوگیا ہے ✦

خان آرزو کہتا ہے کہ شعرائے فارس کے چند طبقے ہیں :-

(۱) رودکی آسدی طوسی فردوسی طوسی وغیرہ ✦

(۲) نظامی انوری خاقانی کمال اسمعیل وغیرہ کہ ان کے کلام میں بہ نسبت طبقۂ اول کے کچھ فرق ہے ✦

(۳) سعدی خواجہ حافظ امیر خسرو جامی وغیرہ انہوں نے پہلی طرز میں کچھ اور تبدیلی کی۔ ان کے بعد ایک اور طبقہ پیدا ہوا کہ

[1] سرہند کی پیدایش تھی مگر دلی میں پرورش پائی ✦

ان کے کلام میں رنگینی اور نزاکت زیادہ تر تھی وہ طبقہ۔
(۴) عرفی ظہوری وغیرہ ہیں۔ صائب بھی اگرچہ اُنہیں میں ہے مگر اُس نے کچھ اور عالم پیدا کیا۔ اُنہیں لوگوں میں جلال اسیر اور قاسم مشہدی اور زلالی وغیرہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی طرز کا نام عالم خیال اور عالم معنی رکھا۔ یہاں تک کہ اسی میں خود بے معنی ہو گئے۔ اور چونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں شعرائے ہند کے صاحب طبع لوگوں میں سے بھی بعض بعض لوگ اُس رستہ پر گئے چنانچہ شاہ ناصر علی اور بیدل اور ارادت خاں واضح وغیرہ اُنہیں لوگوں میں ہیں۔ بزرگوں کی زبانی سُنا گیا ہے کہ شیخ علی حزیں انکے کلام کو سُن کر کہا کرتے تھے کہ از نظم ناصر علی و نثر بیدل ہیچ بفہم نمے آید اگر با یران مے رفتم برائے ریشخند یاراں رہ آوردے ازیں خوبتر نبود۔
کہتے ہیں کہ پہلے پہلے ناصر علی بہت مُتّقی اور پرہیزگار تھا مگر پھر خدا جانے کیا سمجھ میں آیا کہ شریعت کے دائرہ سے نکل کر بے قید مطلق ہو گیا۔ بعض کا قول ہے کہ عالمگیر بادشاہ نے اُسے بُلایا تھا اسے وہم ہوا کہ خدا جانے کیوں بُلایا ہے اس لئے جنون کا بہانہ کرکے کنارہ کیا۔
محمد افضل سرخوش پانی پتی اور مرزا بیدل اس کے ہمعصر اور ہم صحبت اور ہم مشق تھے۔ سرخوش اُس کی نہایت تعریف کرتا ہے۔ اُسے آبروئے ہندوستان لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ افسوس ہے بے فیض زمانہ میں پیدا ہوا اس لئے اپنی لیاقت کے لائق عزت نہ پائی۔ کہتا ہے کہ میں نے اور اُس نے لڑکپن سے ساتھ مشق سخن کی اور ساتھ لکھتا پڑھتا رہا۔ مگر ؎

طالع شہرت رسوائی مجنوں بیش است	ورنہ طشت من و او ہر دو ز یک بام افتاد

ایک دفعہ ابتدائے مشق میں مَیں نے اُس سے کہا کہ ان دنوں بعض امرا

کی صحبت میں گفتگو ہوتی تھی کہ یہ لوگ استادوں کی غزلوں کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ آؤ امتحان تو آسان ہے ایک غزل ہم تم طرح کریں۔ اتفاقاً اُن دنوں میں یہی طرح درپیش تھی آب استادہ است آفتاب استادہ است۔ سرخوش کہتا ہے کہ پہلے میں نے گھوڑا میدان میں ڈالا ؎

تن ز اشکم تا بہ گردن غرق آب استادہ است	سر بروئے آں عیاں ہمچوں حباب استادہ است

حسن مطلع ناصر علی نے کہا ؎

اہل ہمت را نباشد تکیہ بر بازوئے کس	خیمۂ افلاک بے چوب طناب استادہ است

ایک مثنوی یوسف زلیخا کی بحر میں کہی ہے۔ اگرچہ سرخوش بہت تعریف کرتا ہے مگر اصل یہ ہے کہ نزاکت معانی اور لطف الفاظ کے سبب سے مطالب کا پتہ نہیں لگتا ؎

بخفتم یک شب از خندیدن گل بتے میگفت پنہاں با برہمن	کہ دیر سومنا تم بود منزل خدائے من توئی اے بندۂ من

مرا بر صورتِ خود آفریدی
بروں از نقشِ خود آخر چہ دیدی

اسی مثنوی میں وارستہ مزاجوں کی تعریف میں کہتا ہے ؎

بد بنیاد بہ عقبئے درستیز اند	چو برق از ہر دو جانب در گریز اند

سرخوش کہتا ہے کہ پرانے دوستوں میں سے ایک بڈھا ہے کہ نام اُس کا لینا اُس کے لئے موجب رسوائی ہے اُس نے اس مثنوی کے مطلع میں اصلاح دی ہے۔ اصل مطلع :-

الٰہی ذرۂ دردے بجاں ریز	شرر در پنبہ زار استخواں ریز

اِصلاح

الٰہی ذرّۂ دردے بہ تن ریز	شرر در پنبہ زارِ موے من ریز

سرخوش کہتا ہے ؎

من ایں حرف از زبانش چوں شنفتم	چو گل خندیدہ بر رویش بگفتم
چرا ایں حاجت از حق خواہی اے یار	توانم کرد من ہم ایں قدر کار
کہ مشتے خس بآتشش بر فروزم	ہمہ موے سر و ریشت بسوزم
سزاے آنکہ در شعر بلندی	کند زیں گونہ دخل ناپسندی
مناسب نیز دریں ہنگامہ افتاد	برِ اہلِ سخن ایں بیت استاد

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
ہر آنکس پُف زند ریشش بسوزد

سرخوش اُس کی تعریف میں کہتا ہے ؎

در ملکِ سخن بود جہانگیر علی	در مشربِ دل ولیِ علی میر علی
با شعر علی نمیرسد شعر کسے	زانساں کہ خطِ کس بخطِ میر علی

ایک دن ان کے کپڑے بہت میلے ہو گئے تھے گھاٹ پر گئے کہ دھوبی سے دُھلوا لائیں۔ اُس نے مزدوری مانگی۔ اِنہوں نے کہا کہ بھائی تم کپڑے دھوؤ۔ اس عرصہ میں جو کچھ مجھے خدا دے وہ تمہارا۔ ان کے انداز کو دیکھ کر دھوبی بھی کچھ سمجھا اور کپڑے دھونے لگا۔ ایک شخص کہ کسی دور دراز شہر کا رہنے والا تھا اور ان کے کلام کو سُن کر غائبانہ معتقد ہو گیا تھا۔ اتفاقِ آب و دانہ اُسے دلّی لایا۔ وہ لبریزِ اشتیاق جب گھاٹ پر آیا تو پہلے یہی پوچھا کہ ناصر علی شہر میں کہاں رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بھائی وہ ایک دیوانہ باؤلا آدمی۔ تم صاحبِ جاہ و حشم معلوم ہوتے ہو۔ اُس سے مل کر کیا لوگے۔ غرض اسی قیل و قال میں اُسے معلوم ہو گیا کہ حضرت آپ ہی ہیں۔ پہلی ملاقات تھی سر دست اُس نے چند اشرفیاں کمر سے کھول کر نذر دیں۔ انہوں نے

نے اس کے ہاتھ سے لے کر دھوبی کے حوالے کر دیں ۔ (دیکھو تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم)

نوّاب ذوالفقار خاں سپہ سالار عالمگیر کی مدح میں ایک قصیدہ کہ کر لے گیا مطلع ہی پڑھا تھا کہ ذوالفقار خاں نے ایک لاکھ روپیہ مع خلعت و جواہر انعام دیا اور کہا کہ دوسرا شعر نہ پڑھئے کہ میرا خزانہ ان جواہر مضامین کی قیمت کے لئے کافی نہیں اور ہاتھی پر سوار کر کے رخصت کیا۔ وہ مطلع یہ ہے:-

ے	اے شانِ حیدری ز جبینِ تو آشکار نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار	

کہتے ہیں کہ ناصر علی جب وہاں سے نکلا تو اوّل انعام کے لئے نواب کے ملازم اور پھر رستے میں لوگ گرد ہو گئے۔ اس نے بھی ہاتھی ہی پر سے بیٹھے بیٹھے تمام روپیہ لٹانا شروع کیا۔ جب مکان پر پہنچ کر اُترا تو فیل بان نے کہا کہ میرا انعام بھی مرحمت ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ جاؤ یہی ہاتھی تمہارا انعام ہے ۔

دیوان ناصر علی کا دیکھا انتخاب ہے مگر غزلیں کامل بھی ہیں۔ قصیدۂ مذکور کے بھی دو شعر ہیں مگر جو کچھ ہے پہلا ہی مطلع ہے دوسرا شعر اسکے پاسنگ بھی نہیں۔ خدا جانے اور شعروں کا کیا حال ہوگا ۔

ایک دفعہ غزل کہہ کر مشہور کی اور کہا کہ جو کوئی اس کا جواب کہدے تو میں اُس کے کلام کو کلام خدا مانونگا۔ تمام ہندوستان میں غل ہو گیا۔ اُس زمانہ میں احمد عبرت بھی نہایت موزوں طبع صاحب استعداد اور بڑا مشاق تھا۔ یاروں کی فرمایش سے اُس نے غزل کہی اور حقیقتہً کہ اُس نے بھی کوئی مرتبہ چھوڑا نہیں۔ شیخ نے بھی اُسے سُنا مگر چُپکا ہو رہا پھر کچھ کہا نہیں۔ چنانچہ وہ دونو غزلیں یہاں لکھی جاتی ہیں:-

غزل

مقیم کوے تو سختی کشانِ دل تنگ اند
که ناله گر نه کند فاش آتش سنگ اند

ملائمت ز تنگ ظرفیِ گر بجنت است
که شیشه‌ها چو در انداختی بهم سنگ اند

شکر لبانِ دلِ بیرحم در کمیں دارند
بتان ما ز برون لعل و از درون سنگ اند

طلسم صورتِ ما بر بتان شکست آورد
وگرنه دیر و حرم خانه زادِ یک سنگ اند

ز خامیِ ثمرِ نو نهال شکوه مکن
که پختگان همه بهر شکست خود سنگ اند

غزل احمد عبرت

بوادیِ تو که واماندگانِ دل تنگ اند
ز اشک خویش روان همچو چشمه سنگ اند

جهانیان چه قدر محو صورت افتادند
همه ز منزل معنی هزار فرسنگ اند

تبسّم تو بجوں گشتنم مهیّا کرد
دلِ من و لب لعل تو شیشه و سنگ اند

بقیدِ هوش ببینند وحشیانِ جنوں
اگرچه جمله شرارند فارغ از سنگ اند

جمال کس چه حساب است با تو سنجیدن
به پلّه که توئی دیگران چو پاسنگ اند

تبسّمت چو گل این غنچه را چه خوں که نکرد
دلِ من و لب لعل تو شیشه و سنگ اند

نسب به سنگ رسد گر فسرده طبعان را
بعرض حوصله چوں طبع خویش بے‌ننگ اند

علوِّ مرتبه عبرت ز فیض عزلتها ست
وگرنه قطره و گوهر شرار یک سنگ اند

سرخوش بھی اتنا تو کہتا ہے کہ اُس نے اپنے تئیں دیوانہ بنا رکھا تھا اور آخر کو دلّی میں قطبیت کا دعوے کر کے ہو بیٹھا - چھٹی رمضان ۱۱۰۸ ہجری کو انتقال کیا ؎

وارسته علی همّتِ بے پروا
از راحت و رنج دهر مستغنی رفت

دائم چه تو جنبش سوے معنی داشت
دل کنده ز صورت کده هستی رفت

سرخوش زخرد سال وفاتش پرسید
گفت آه علی بعالم معنی رفت

چند اشعار اُس کے جو سرخوش نے میر مُعز موسوی خاں فطرت کی بیاض میں انتخاب کئے ہوئے پائے بعض اُن میں سے لکھے جاتے ہیں +

غزل

امشب کہ بے تو بزم سخن نیم رنگ بود — رنگے کہ بازگشت بدل زخم سنگ بود
در دل طپش زجوش خیالِ تو رہ نیافت — آئینہ شد چراغ کہ کاشانہ تنگ بود
گو در رہت برنگِ شفق فوجِ بسمل است — امروز با دل کہ خیالت بجنگ بود

تا آسماں ز دیدۂ قربانیاں براست
با آنکہ عشق را بکماں یک خدنگ بود

ندارد حسرتِ دل تابِ حسنِ بے حجابش را — کہ باشد صافیٔ آئینہ شبنم آفتابش را
نظرہا غافلِ عالم پُر از کیفیت حسنش — بود حکم پری در شیشہ ہا رنگ شرابش را
بحشر حرف بے صوتست فریادِ شہیدانش — نمیدانم کہ داد ایں سرمہ چشم نیم خوابش را
بشوخی پاے او بوسیدنِ قالب تہی کردن — کدامی بے ادب تعلیم فرما شد رکابش را
ندانم دل شہید کیست لیکن ایں قدر دانم — کہ از شمشیر او رنگیست موج اضطرابش را

بایں شوخی غزل گفتن علی از کس نمے آید
بایراں میفرستم تا کہ بنویسد جوابش را

میر معز الدین موسوی خان فطرت

سید عالی خاندان تھا۔ عہد عالمگیر میں ایران سے ہندوستان میں آیا سرخوش اور ہر ایک صاحب تذکرہ شرافت و نجابت کے ساتھ اس کی خوش خیالی اور معنی آفرینی اور شعر فہمی اور انشا پردازی کے مداح ہیں۔ علم معقولات میں بھی دستگاہ بے مثل رکھتا تھا۔ چنانچہ خود کہتا ہے اور سچ کہتا ہے ؎

من مرغ خوش ترانۂ باغ فضیلت ام
طبع مرا بزمزمۂ شاعری چہ کار

صاحب فضیلت ہو کر شاعری میں ایسا صاحب کمال ہونا تعجب کا مقام ہے اس کی بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی اور لطیفہ پسندی سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش مزاج اور شگفتہ طبع تھا۔ اس قسم کی جوہر دار طبیعتیں اور روشن ذہن قدرتی ہیں۔ جنہیں خدا دیدے دیدے۔

اس کی عالی خاندانی اور اوضاع و اطوار شریفانہ پر نظر کر کے عالمگیر اس کی بہن کو باصرار عقد نکاح میں لایا تھا۔ پہلے فطرت تخلص کیا تھا بعد اس کے موسوی اختیار کیا اور اس سے بہت خوش تھا۔ چنانچہ خطاب خانی کا بھی اسی پر لیا۔ مغز سخن کو ایسا پہنچتا تھا کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔ ایک شخص ایران سے تازہ وارد تھا اس نے ایک جلسہ میں بیان کیا کہ شاہ عباس نے ایک عمارت عالیشان بنوائی تھی اور مرزا صائب نے اس کی تعریف میں قصیدہ کہا ہے۔ اسی میں یہ شعر ہے ؎:-

چوں لباسِ غنچہ تنگی میکند بر دوش گل		بر شکوہِ ایں عمارت پرنیانِ آسماں

میر موصوف نے اُس کے سامنے اعتراض کیا اور قباحت ظاہر کی۔ چنانچہ سرخوش جس نے اس کی صحبت سے شاگردوں کی طرح فیض پایا تھا کہا کہ ؎

چوں لباسِ غنچۂ نشگفتہ تنگی میکند		بر شکوہِ ایں عمارت پرنیانِ آسماں

میر نے سُن کر کہا کہ ہاں اب ٹھیک ہوا ؛

اسی طرح صائب نے خود ایک دن اپنا یہ شعر پڑھا۔ ع

عیبے بہ عیب خود نرسیدن نمیرسد

محمد سعید اشرف نے اس پر اعتراض کیا کہ ایک باے صلہ اس میں اور چاہیئے اور بہت سی ردّ و بدل کے بعد صائب کو تسلیم کرنا پڑا۔ گویا اصل میں یوں چاہیئے کہ :۔ عیبے بایں عیب نمیرسد کہ آدم بہ عیب خود نرسد ؛

ایک شخص کا شعر تھا کہ ؎

ز تیرہ بختی من آں زماں شدم آگاہ		کہ مادرم سرِ پستانِ خویش کرد سیاہ

میر نے سُن کر کہا کہ مضمون تو بہت خوب ہاتھ آیا ہے مگر شاعر باندھ نہیں سکا لاؤ اسے درست کر کے باندھیں ؎

ایں تیرگی ز روزِ ازل داشت کوکبم		مادر نزادہ ام سرِ پستاں سیاہ کرد

وحید کا شعر ہے کہ ؎

ہر گل بیادِ شمع تو بالے کشودہ است		خاکسترم چمن شد و پروانہ ام ہنوز

میر نے سُن کر تامّل کیا اور کہا ؎

شد گرد بادِ دامنِ صحرا غبارِ من		بر باد رفت خاکم و دیوانہ ام ہنوز

ایک دن کسی کی یہ بیت پڑھتا تھا اور مزے لے لے کر تعریفیں کر رہا تھا ؎

بچہ اندیشہ ام از خاطرِ ناشاد روی		چہ بخاطر گذرانم کہ تو از یاد روی

سرخوش بھی بیٹھا تھا اس نے سُن کر کہا کہ آؤ اسی کو طرح کر کے طبع آزمائی کریں ؎

آنچنان زی کہ چو از حادثہ برباد روی	حسن معنی نگذارد کہ تو از یاد روی

سرخوش نے کہا ؎

خویش را خاک رہے سازی و برباد روی	بہ از انست کہ بر تخت رواں شاد روی

ایک دن میاں ناصر علی کی اس بیت کا ذکر آیا ؎

ز جوش بادہ دردِ تہ نشیں بالا نشیں گردد	ز موج خندہ نر سم خط بروں آید از لبہا

سرخوش کہتا ہے کہ میر نے اُسی وقت کہا مگر معلوم ہوتا تھا کہ بڑی کاوش طبع کر کے کہا ہے ؎

مگر بر سستی بالیدہ می نازد ز مژگانش	سخن در برگ گل پیچیدہ میریزد از لبہا

سرخوش کہتا ہے کہ میں بھی گرتا پڑتا پیچھے پیچھے پہنچا اور کہا کہ ؎

نظرہا از لطافت بر رخش باران ورآبست	سخن نقش نگیں گشت از فرو رفتن دراں لبہا

حسن ابدال کے مقام میں ایک مطلع کہا کہ تمام شعرائے پایۂ تخت میں ایک دھوم مچ گئی ؎

ہیچکس آگہ ز دردِ اشتیاق ما نشد	نامۂ ما چون زبانِ لال ہرگز وا نشد

سرخوش کہتا ہے کہ میں نے بھی ایک مطلع اس پر کہا ؎

ہیچ دل را زینتِ دنیا نشاط افزا نشد	عقدۂ کارِ کس از دندانِ گوہر وا نشد

شعرا اور سخن فہموں نے کہا کہ سرخوش کا مطلع میر سے بھی اچھا ہوا ہے۔ مگر سرخوش نے خود کہا کہ حق سے نہیں گزرنا چاہیئے میر کی تشبیہ نئی ہے میری تشبیہ معمولی اور متعارف ہے۔ میر نے بھی یہ بات سُنی اور کہا کہ آفرین ہے طبع منصف اسے کہتے ہیں ؛

باوجودیکہ اہلِ ایران ہندوستان کے شاعروں کو کم نظری سے دیکھتے ہیں مگر میر مذکور کے حال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں یہ بات نہ تھی۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں نے ہندوستان میں آکر یہی تین شاعر دیکھے۔ غنی۔

ناصر علی - سرخوش - اور حقیقت میں سرخوش کو زبان اور شعر فارسی کا بڑا ذوق تھا - ہر ایک کلام کو خیال میں رکھتا تھا اور اُس کی باریکیوں پر نظر رکھتا تھا - ایک دن میر موصوف کے پاس کوئی شخص ایک مصرعہ لایا اور کہا کہ اس پر پیش مصرع لگادو - مصرع یہ تھا - ع

فانوس گرد و باد شود بر چراغ ما

میر نے کہا کہ دیکھو میں سرخوش سے پوچھونگا وہ تازہ گویوں کے کلام پر بہت نظر رکھتا ہے - اگر کسی اور نے نہ کہا ہوگا تو میں کہہ دونگا - سرخوش سے پوچھا اُس نے سُنتے ہی کہا کہ صائب کا ہے ؎

آشفتگی ز عقل پذیرد دماغ ما	فانوس گرد و باد شود بر چراغ ما

میر بھی سرخوش پہ ایک محبت کی نظر رکھتا تھا اور اس کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا - ایک دن دلّی کے دیوان عام کے ایک در میں میر ممدوح چند دوست آشناؤں کے ساتھ بیٹھا تھا - سامنے سے دیکھا کہ دو شخص دربار میں سے خلعت پہن کر نکلے - سب کو خیال ہوا کہ یہ کون دو شخص ہیں اور کس بات کا خلعت انہیں ملا ہے - میر نے سرخوش کو اشارہ کیا - یہ گیا تو معلوم ہوا کہ ایک کو صوبۂ برار کی حکومت کا خلعت ملا ہے اور دوسرے کو اُس کی شادی کا - سرخوش نے آکر کہا کہ جناب ایک کو برآر کا خلعت ہوا ہے اور ایک کو درآر کا - میر نہایت محظوظ ہوا اور سب لوگ ہنسنے لگے ؀

لطیفہ - ایک دن کوئی شاعر یادہ گو اپنے اشعار میر کو سناتا تھا اور داد چاہتا تھا - کسی مقام پر ایک لفظ غلط ایسا بیہودہ باندھا تھا کہ میر نے ٹوکا - اُس نے کہا کہ ضرورت شعر کے لئے - میر نے کہا کہ تمہیں شعر کہنا کیا ضرور تھا ؀

میر نے ایک دن اپنے پیدا ہونے کی تاریخ خود بیان کی کہ :-

افضلِ اہلِ زمانہ (سنہ ۱۰۵۰ھ)

سرخوش نے عرض کی کہ میں بھی اسی سال میں پیدا ہوا ہوں یہ تو مجھے عنایت ہو کیونکہ میرا تو نام بھی افضل ہے - آپ اپنے لئے اور کہہ لیجئے گا - ہنس کر کہا کہ اچھا خدا مبارک کرے ؀

سرخوش اس کے مرنے کا بہت افسوس کرتا ہے - چنانچہ کئی تاریخیں کہیں ایک اُن میں سے یہ ہے ؎

کشیدہ آہ و گفتا عقل تاریخ | معزالدین محمد موسوی رفت

دوسری تاریخ کا مادّہ یہ ہے - ع

خضر گفتا کجا شد موسوی خاں

مرزا صائب

نام اس شاعر عالی مقام کا محمد علی وطن شہر تبریز تھا - ایسا پُرگو اور خوشگو تازہ خیال اور صاحب کمال نہیں ہوا - طرزِ قدیم میں فقط اداے مطلب اور حسن محاورہ ہوتا تھا - ظہوری اور عرفی وغیرہ متاخرین نے استعارہ اور رنگینی حد سے زیادہ کردی کہ جس سے اشکال زیادہ ہوا اور فصاحت میں خلل آگیا - اس نے پھر فصاحت کو بھی زندہ کیا اور استعارہ کی نمکینی کو بھی قائم رکھا - اصل وطن اس کے بزرگوں کا تبریز تھا - باپ اس کا سوداگر پیشہ تھا - شاہ عباس بہت سے اہل تبریز کو اُٹھا کر اصفہان میں لایا اور محلہ عباس آباد میں (جو اپنے نام سے تعمیر کیا تھا) آباد کیا - اہل تبریز ملک فارس

میں محنت کشی اور تیز فہمی اور چالاکی میں ایسے مشہور ہیں جیسے ہندوستان میں کشمیری ۔ غرض صائب اگرچہ عالم فاضل تو نہ تھا لیکن طبیعت موزوں کے سبب سے شاعری کا شوق رکھتا تھا ۔ اوّل حکیم رکنائے کاشی سے اور پھر حکیم شفیع اصفہانی سے اصلاح لی ۔ شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ میں بطریق تجارت ہندوستان میں بھی آیا اور شعرائے پائے تخت میں داخل ہوا لیکن بسبب حُبّ الوطن کے یہاں دل نہ لگا ۔ ظفر خاں سبزواری کے ساتھ (جو امرائے عالیشان دربار سے تھا) کشمیر اور کابل سے لے کر دکن تک سیر کی اُس کی تعریف میں چند قصیدے بھی موجود ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظفر خاں کو بھی جُدائی اُس کی منظور نہ تھی ۔ سنہ ۱۰۴۱ ہجری میں جبکہ صائب اُس کے پاس دکن میں تھا ۔ باپ اُس کا محبت پدری سے بیقرار ہو کر یہاں تلاش میں آیا ۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں رخصت مانگتا ہے اور کہتا ہے ؎

هفتاد ساله والد پیراست بنده را ‏ ‏ ‏ کز تربیت بود بمنش حق بے شمار

آورده است جذبهٔ گستاخ شوق من ‏ ‏ ‏ از اصفهان بآگره و لاهورش اشکبار

زاں بیشتر کز آگره بمعمورهٔ دکن ‏ ‏ ‏ آید عناں گسسته تر از سیل اشکبار

ویں راه دور را ز سر شوق طے کند ‏ ‏ ‏ با قامتِ خمیده و با پیکر نزار

دارم امید رخصتے از آستانِ تو ‏ ‏ ‏ اے آستانت کعبهٔ امید روزگار

یہاں سے جا کر شاہ عباس کے دربار میں ملک الشعرا ہوا ۔ ظفر خاں کی تعریف میں وہاں سے بھی اشعار کہہ کہہ کر بھیجتا تھا چنانچہ ایک دفعہ یہ شعر بھیجا ؎

دور دستاں را بہمّت یاد کردن مردمی است ‏ ‏ ‏ ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

اُس نے پانچہزار روپے بھیجے ۔

بادشاہانِ روم و ترکستان و ہندوستان وغیرہ اس کے اشتیاق میں شاہ ایران کو مراسلے لکھتے تھے اور غزلیں صائب کی بطریق تحفہ فرمایش کرکے منگاتے تھے ۔ ۸۰ ہزار شعر اس کے دیوان میں مَیں نے گنے لیکن ناتمام تھا ۔ غنی کشمیری کے کلام میں جو کچھ اس نے داد انصاف دی ہے وہاں سے دیکھنا چاہیئے ۔

غرض کہ اُس کی تعریف میں تمام تذکرہ نویسوں کی زبان خشک ہوتی ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ سعدی نے غزل کا قالب ڈھالا ۔ بابا فغانی نے اُس میں دم ڈالا ۔ صائب نے اُسے خلعتِ شاہانہ پہنا کر دربار میں نکالا ۔ اشعار اُس کے خاص و عام کی زبان پر ہیں اور لطف یہ ہے کہ جس سے سُنئے نیا شعر سُننے میں آتا ہے ۔ اس کے شعر میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ جو مضمون باندھتا ہے اُس میں اُس کی مثال بطور ثبوت کے موجود ہوتی ہے کہ بات دل پر نقش ہو جاتی ہے ۔ اُس طرز خاص میں کوئی شاعر اس طرح پابندی اس صنعت کی نہیں کرسکا ۔ مشق کامل اور طبیعت نہایت حاضر تھی ۔ ایک دن ایک شاگرد مصرع بے معنی کہہ کر لایا ۔ ع

از شیشۂ بے مَے مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے فوراً کہا ؎

حق را ز دلِ خالی از اندیشہ طلب کن	از شیشۂ بے مَے مئے بے شیشہ طلب کن

ایک شاگرد نے چند مصدر بے معنی ایک مصرع میں موزوں کئے ۔ صائب نے اُس پر ایک ایسا مصرع لگایا کہ شعر برجستہ ہوگیا ؎

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را	دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

ایک دن گنگے کو رستے میں بیٹھا دیکھ کر کسی نے یہ مصرع کہا ۔ ع

سگِ نشستہ ز استادہ سرفراز تر است

صائب نے اُسی وقت کہا ؎

شود ز گوشہ نشینی فزوں رعونتِ نفس	سگِ نشستہ ز استادہ سرفراز تر است

ایک امیر نے ایک مصرع کہا تھا کہ مصرع ثانی اُس کا بہم نہ پہنچتا تھا۔ ع

ساغرِ نیمہ و لبریز نہ دیدہ است کسے

صائب نے کہا ؎

نیم جانی کہ مرا بود رسیدہ است بہ لب	ساغرِ نیمہ و لبریز ندیدہ است کسے

ایک دفعہ صائب نے ایک مصرع کہا۔ ع

صبا را شرم می آید بروے گل نگہ کردن

اور دوسرا مصرع نہ بہم پہنچتا تھا۔ بزاز آیا اور کپڑا دکھایا جب تھان کو تہ کرنے لگا تو نشان پر تہ نہ بیٹھی اتفاقاً مصرع مذکور بھی تلاش مصرع دوم میں اُس کی زبان پر تھا۔ اسی وقت شعر پورا ہوا کہ ؎

صبا را شرم می آید بروے گل نگہ کردن	کہ رختِ غنچہ را وا کرد و نتوانست تہ کردن

غرض اسی طرح کی رسائی ذہن اور حاضر جوابیاں بہت ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے شاعری کا شوق دلی تھا کہ کوئی دم اُس سے خالی نہ رہتا تھا اور ہر وقت اُسی کی فکر میں غور کرتا رہتا تھا۔ منصف اور حق پسند ایسا تھا کہ ایک خربوزہ فروش اصفہان میں اس صدا سے سودے بیچتا تھا ع

من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

مرزا کو یہ مصرع بہت پسند آیا۔ اُس سے کہا۔ نہایت اصرار سے کئی ہزار روپیہ دے کر یہ مصرع خریدا یعنی شرط کر لی کہ بیچنے میں پھر یہ مصرع نہ پڑھے اور پیش مصرع اُس پر لگا کر مطلع کر لیا ؎

یکتے بر دو از دل گزرد ہر کہ ز پیشم	من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

مضامین حکمت اور نصیحت اور تجربہ کے بہت کہتا ہے۔ ایک مصرع میں جو کچھ کہتا ہے دوسرے مصرع میں مثال سے اُسے ثابت کر دیتا ہے۔ بروقت گفتگو اور صحبت کے کلام اس کا کارآمد ہوتا ہے۔ سوائے دیوان کے اور کوئی کتاب اس کی نظم و نثر میں نہیں دیکھی گئی۔ مگر دیوان بھی کئی کتابوں کے برابر ہے۔ درویش املاے بلخی نے اس قسم کے کل اشعار اُس کے دیوان میں انتخاب کئے اس کا نام واجب الحفظ رکھا۔ دس ہزار سے کم نہیں ٭

وفات صائب کی سنہ ۱۰۸۱ھ میں ہوئی۔ سرخوش کہتا ہے کہ ایک دن میرمعز موسوی خاں کے ہاں میں بیٹھا تھا۔ ایک سوداگر ایران سے آیا اُس نے اثنائے تقریر میں یہ ذکر کیا کہ صائب وفات یافت۔ میں نے کہا کہ بھی اُس کی وفات کی تاریخ بھی ہے۔ مجھ سے دونوں نے کہا کہ تم نے پہلے ہی کہہ رکھی تھی۔ میں نے کہا کہ دو برس پہلے صاحب کے مرنے کی تاریخ کہی تھی کہ صاحب وفات یافت۔ اُسی پر خیال کر کے اب میں نے کہا کہ صائب وفات یافت (سنہ ۱۰۸۱ ہجری) ٭

اصفہان میں ایک سبزہ زار میں نہر کے کنارے مدفون ہے اور یہ شعر قبر پر لکھا ہے ؎

اے صبا بر برگہائے غنچہ پا آہستہ نہ
پاسبانان اندگلہا صائبا خوابیدہ است

اشعارِ منتخب

طاعت کند سرشکِ ندامت گناہ را
نقصے بسرکشاں ز تواضع نمی رسد
زافتادگی بمسندِ عزت رسیدہ است

بارش سفید میکند ابر سیاہ را
حسن از شگفتگی شود افزوں کلاہ را
یوسف کند چگونہ فراموش چاہ را

از عشق پاک دائرۂ حسن شد تمام | آغوش ہالہ ساخت کمربستہ ماہ را

خواہد بصد نیاز ز درگاہ بے نیاز
صائب دوام دولت عباس شاہ را

بدبنیا ساختم مشغول چشم روشن دل را | بایں یکمشت گل مسدود کردم روزن دل را
ندانستم کہ خواہد رفت چندیں خار در پایم | شکستم بے سبب در خرقۂ تن سوزن دل را
فریب جسم خوردم کشتیم در گل نشست آخر | ہمی ماندم بجا گر مے گرفتم دامن دل را
مرا گر ہیزم دوزخ کند افسوس جا دارد | کہ بے برگ از ثمر کردم نہال ایمن دل را

ز آتش طلعتاں باغ و بہارے داشتم صائب
ندیدم روز خوش تا سرد کردم گلخن دل را

بہر تردامنے منما ئے آں آئینۂ رو را | مبادا از زنگ خجلت سبز سازد حرف بدگو را
ترا صد بار گر بینم ہماں مشتاق دیدارم | تہی چشمی ز گوہر کم نمی گردد ترازو را

تکلف نیست در گفتار رند لاابالی را | چنانت دوست میدارم کہ عاشق شعر حالی را

شد از رکاب تو پیدا ہلال عید مرا | کشودہ شد در جنت ازیں کلید مرا

آئینہ شو وصال پری طلعتاں طلب | اول بروب خانہ دگر میہماں طلب
گل میخ آستانۂ عشق است آفتاب | ہر جا جبینے کہ داری ازیں آستاں طلب
چوں سبزہ زیر سنگ حوادث چہ ماندۂ | ہمت ز دست و بازوے رطل گراں طلب
معیار دوستان دغل روز حاجت است | قرضے برسم تجربہ از دوستاں طلب

خواہی کہ جاے در دل شیریں لباں کنی
ہمت ز کلک صائب شیریں زباں طلب

بیقراران را از آن یکتای بی همتا طلب
چون شود از دشت غائب سیل در دریا طلب

دست خواهش را نه بکشا پیش دست خاکیان
هرچه میخواهد دلت از عالم بالا طلب

اهل همت را گذر در سر دادن خطاست
آرزوی هر دو عالم را از و یکجا طلب

عشق آتش دست می بندد دهان عقل را
مرهم این زخم از خاکستر دلها طلب

هیچ قفلی نیست در بازار امکان ناپدید
بستگیها را کشایش از در دلها طلب

گر ز خاک آسودنت آسوده میگردند خلق
تن بخاک تیره ده آسایش دلها طلب

چشم چون بینا شود خضر است هر نقش قدم
رهبر بینا چو خواهی دیدهٔ بینا طلب

آبرو در پیش ساغر ریختن دون همتی است
گردن کج میکنی بارے مے از مینا طلب

این جواب آن غزل صائب که شیدا گفته است
گر تو جویا طالبی مطلوب بی همتا طلب

بردار دل ز عالم خاکی صفا طلب
از تنگنای جسم برون آ هوا طلب

در جستجوی خانهٔ در بسته است فیض
از فکر بار غنچه شو آنگه صفا طلب

روشن نمیشود دل تاریک از آفتاب
این روشنائی از نفس گرم ما طلب

دنیا و آخرت چه بود پیش جود حق
همت بلند دار ز حق هر دو را طلب

پیدا نشد کسیکه درین راه گم نشد
گم شو ز خود نخست دگر رهنما طلب

صائب دعای بی اثران با اثر بود
بگذار اثر ز خویش اثر را دعا طلب

بلند نام نگردد کسیکه در وطن است
ز نقش ساده بود تا عقیق در یمن است

مشو بمرتبه پست از سخن قانع
که طول عمر بقدر بلندی سخن است

بیکیست معنی اگر لفظ بیشمار بود
بیکیست یوسف اگر صد هزار پیرهن است

ز مرگ مرده دلان از طلب فرو مانند
وگرنه جامهٔ احرام اهل دل کفن است

نه همین اهلِ خرد آئینهٔ اسرار اند
که زخود بیخبران نیز خبرها دارند
خاکساری نه بنائیست که ویران گردد
سیلها عاجز کوتاهیِ این دیوار اند

صحبت بحریفانِ سیه کار مدارید
بر روی سخن آئینه تار مدارید
ظاهر نشود در دلِ نادان اثرِ حرف
در پیش نفس آئینه تار مدارید

هر که زشت است همان زشت بعقبیٰ خیزد
کور از خواب محالست که بینا خیزد
خازن مرگ مبدل نه کند گوهر را
جاهل از خواب محالست که دانا خیزد
رحمت از دامن دل گردِ گنه پاک کند
تیرگی از دلِ سیلاب بدریا خیزد

هنگامهٔ شراب کمین گاه آفت است
در محفلی که باده خوری بیخبر مباش

سرے را که بالین بود آستانش
بود بخت بیدار خواب گرانش

در گلستان بلبل و در انجمن پروانه باش
هر کجا دامِ تماشائے که بینی دانه باش
کفر و دین را پرده دار جلوهٔ معشوق دان
گاه در بیت الحرام و گاه در بتخانه باش
تا شوی چشم و چراغ اینجهان چون آفتاب
پوشش هر تنگدست و فرش هر ویرانه باش
بے محبت مگذران عمرِ عزیزِ خویش را
در بهاران عندلیب در خزان پروانه باش
تا مگر صائب چراغ کشته‌ات روشن شود
هر دل گرمے که یابی گرد او پروانه باش

بدوشے که بر قلب گردون زنیم
ازین شیشه چون رنگ بیرون نهیم
سرانجام چون خشت بالین بود
بخم تکیه همچون فلاطون زنیم

از برائے کام دنیا خویش را غمگیں مکن / پشت پا زن بر دو عالم خویش را سنگیں مکن
نخل نوخیز تو بہرِ بوستانِ دیگر است / ریشہ محکم در زمینِ عاریت چندیں مکن
چشم خواب آلودہ را در گوشۂ نسیاں گذار / راہ دورے پیش داری بار را سنگیں مکن
ہر چہ پیشت آورد قسمت بآں خورسند باش / از برائے زیستن اندازہ تعییں مکن

در بروں رفتن ز بزم زندگی غافل مشو / نیستی خضر از گرانجانانِ ایں محفل مشو
فربہی از خوانِ مردم ہیچ باریک آورد / ہمچو ماہِ نو بنورِ عاریت کاہل مشو

بمن شد رام آں سروِ جواں آہستہ آہستہ / بلے کمزور میگردد کماں آہستہ آہستہ
ز بس گردِ سرش گشتم ز بس در پایش افتادم / بمن مائل شد آں سروِ رواں آہستہ آہستہ
ازاں نازک نہال اے دل ببوئے گل قناعت کن / بحاصل میرسد نخلِ جواں آہستہ آہستہ
حریفِ دلبرانِ شہرِ قزویں نیستی صائب / بکش خود را بشہرِ اصفہاں آہستہ آہستہ

اگر دل از علائق کندہ باشی / بمنزل بار خود افگندہ باشی
گریبانِ تو طوقِ لعنتِ تست / گر از کبر و عجب آگندہ باشی
اگر دل برکنی زیں چار دیوار / درِ خیبر ز جا برکندہ باشی
چناں گرم از بساطِ خاک بگذر / کہ شمعِ مردمِ آیندہ باشی
ترا دادہ است زیبائے قماشے / کہ در ہر جامۂ زیبندہ باشی

قصائد

ایں چنیں ہجراں گدازد مرا در پیچ و تاب / زود خواہد خیمۂ عمرم شدن کوتہ طناب
داستانِ حسرتم از زلف طولانی تر است / یک الف دار است از طومار آہ من شہاب

رشتۂ امید من صد دانہ گردید از گرہ — چند خواہی داشت اے گردوں مرا در پیچ و تاب
اینہمہ فریاد من اے چرخ میدانی کہ چیست — از فراق موکب نواب خورشید انتساب
قبلۂ ارباب معنی کعبۂ اہل نیاز — آنکہ آمد از فلک اورا ظفر خانی خطاب
آنکہ رعد ہیبتش گر بانگ بر گردوں زند — در کماں قوس قزح را بشکند تیر شہاب
ابر جودش سایہ گر بر روے دریا گسترد — چوں صدف آبستن گوہر شود بکر حباب
تا نگردیدہ است بار خاطرت طول سخن — میکنم ختم مدیحت بر دعاے مستجاب
تا ز بزم و رزم در عالم بود نام و نشاں — تا بود جوہر بہ تیغ و نشہ در جام شراب

دوستانت را لب پیمانہ بادا بوسہ گاہ
دشمنانت را ز زخم تیغ بادا پیچ و تاب

خوشا عشرت سراے کابل و دامان کہسارش — کہ ناخن بر دل گل میزند مژگان ہر خارش
خوشا وقتیکہ چشم از سوادش سرمہ چیں گردد — شوم چوں عاشقان عارفان از جاں گرفتارش
ز وصف نالۂ او رنگ بر روے سخن دارم — نگہ را چہرہ خوں سازم ز سیر ارغواں زارش
نظرگاہ تماشائیست در روے ہر گذرگاہے — ہمیشہ کاروان مصری آید بہ بازارش
حساب مہ جبینان لب بامش کہ میداند — دو صد خورشید رو افتادہ در ہر پاے دیوارش
بصبح عید میخندد گل رخسارہ صبحش — بشام قدر پہلو میزند زلف شب تارش
تعالی اللہ از باغ جہاں آرا و شہر آرا — کہ طوبی خشک بر جا ماندہ است از رشک اشجارش
خضر نیرے بتاریکی فگند از چشمۂ حیواں — بیا اینجا حیات جاوداں برگیر ز انہارش
تکلف برطرف ایں قسم ملکے را باین زینت — سپہدارے چو نواب ظفر خاں بود در کارش

الٰہی تا جہاں آرا و شہر آرا بجا باشد
جہاں آرائی و آرایش کشور بود کارش

نبیدانند اہل غفلت انجام شراب آخر — بآتش میروند این جاہلاں از راہ آب آخر
ز کار افتاد چوں ظالم باہل ظلم پیوندد — کہ بال تیر میگردد پر و بال عقاب آخر

مرزا بیدل

عبدالقادر نام بیدلؔ تخلص۔ مولد ہندوستان۔ قوم ترک۔ قبیلۂ برلاس[1] سے تھا۔ زورِ طبیعت اور مشقِ شاعری میں اہلِ سخن اس کو رستمِ فن اور پہلوانِ سخن کہتے ہیں۔ آغاز شباب میں اعظم شاہ پسر عالمگیر کی سرکار میں نوکر تھا اور اپنے شوق سے شعر کہتا تھا۔ ایک دن دربار میں شعرائے وقت کا ذکر آیا۔ کسی امیر نے کہا کہ مرزا عبدالقادر جو حضور کے دربار میں ملازم ہیں اُن سے زیادہ آج کل کوئی شاعر نہیں۔ شاہزادہ نے کہا تعجب ہے کہ ہماری تعریف میں آج تک کچھ نہیں کہا۔ اُن سے کہو کہ ایک قصیدہ کہیں تاکہ زورِ طبیعت معلوم ہو اور بموجب اُس کے اضافۂ منصب کیا جاوے۔ جب ان کو خبر ہوئی فوراً استعفا دے دیا۔ دوستوں نے بہت سمجھایا مگر قبول نہ کیا۔ نہ پھر کسی کی نوکری کی۔ ڈاڑھی مُوچھ مُنڈا کر آزاد ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ ایک لاکھ شعر دیوان میں ہیں۔ مگر ایک شعر کسی کی تعریف میں نہیں۔ بُڈّھے بُڈّھے آدمیوں سے (جو اُس کے قریب زمانہ میں موجود تھے) سُنا گیا کہ بیدل بہت قوی ہیکل آدمی تھا۔ ایک جریب یعنی عصا لوہے کا بہت بھاری ہاتھ میں رکھتا تھا۔ اُسے نولاسی کہتے تھے۔

عربی میں استعداد اس کی شافیہ۔ شرح ملّا وغیرہ تک تھی۔ فارسی کا حال خود ظاہر ہے۔ کلام ان کا فقط استعارہ اور خیالِ محض تصوف کے رنگ میں

[1] برلاس ایک شاخ فرقِ چغتائیہ کی ہے اور ترکی قدیم میں بمعنی ہمنشین و ندیم ہے۔ (روضۃ الصفا)

ہوتا ہے۔ باوجود پرگوئی کے نظم و نثر بہت زبردست لکھتا ہے۔ مضامین
اس قدر باریک باندھتا ہے کہ اکثر اشعار میں سے معنے بھی بمشکل نکلتے ہیں
مگر اہل ترکستان مثل مولوی روم کے اس کی بھی تعظیم کرتے ہیں۔ چونکہ اہل زبان
کے کلام میں بنیاد فصاحت اور صفائی پر ہوتی ہے اس لئے اہل ایران
پسند نہیں کرتے۔ بعض محاورات اپنے قیاس سے بھی ایجاد کرتا ہے مثلاً
امروز و امشب کی طرح امصبح امشام بولتا ہے کہ یہ محاورہ اہل ایران میں
کہیں دیکھا یا سنا نہیں گیا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اوّل تو اصل ایرانی نہیں
ترکستانی ہے۔ دوسرے ہند میں پرورش پائی۔ تیسرے طبیعت چالاک تھی
اور خود آزاد مزاج اور خود پسند تھا۔ استاد زبردست کے ہاتھ کے نیچے نہیں
نکلا کہ وہ راستہ پر لاتا اس واسطے بے اصول رہ گیا۔ اپنے بیٹے کے
مرثیہ میں ایک مخمس کہا ہے اس میں کہتا ہے ؎

ہر گہ دو قدم خرام میکاشت	از انگشتم عصا بکف داشت

اگر فارسی زبان کوئی بولے تو چاہیئے کہ جس طرح اہل فارس بولتے ہیں
اُس طرح بولے۔ اہل فارس نے آج تک خرام کاشتن کہیں نہیں کہا۔
اسی طرح ترکیب وحشت رم کہ دونو لفظ مترادف ہیں۔ دیکھو قرآن جو سب
زبانوں کے پیدا کرنے والے کا کلام ہے۔ موافق محاورۂ اہل عرب کے
ہے۔ اگر کہیں محاورۂ قریش کے خلاف ہوتا تو سارے فصحا و شعرا اُٹھ کھڑے
ہوتے اور پیغمبر صاحب کو کہتے کہ یہ کیا قرآن ہے کہ عربی میں ہے اور ہمارے
محاورہ کے برخلاف ہے۔ اسی طرح غیر ملک کے آدمی بھی جب فارسی میں
بات کریں تو چاہیئے کہ فارس والوں کے محاورہ کے بموجب بات کریں۔
اگر اس کے برخلاف بات کریگا تو وہ فارسی نہ ہوگی۔ ان کے گھر کی
باتیں ہونگی ؏

لطیفہ

ایک دن قمر الدین خاں وزیر بادشاہ کے مکان پر گیا - وہ نماز پڑھتا تھا کہ نواب محمد امین خاں بھی اس کی ملاقات کو آیا - پہلوان سخن چار ابرو کی صفائی کئے فولاسی آگے رکھے بیٹھے تھے - یہ ڈیل ڈول اور رنگ ڈھنگ سب سے نرالا دیکھ کر اس نے نام پوچھا - جب نام سے مسلمان معلوم ہوا تو چیں بجبیں ہو کر پوچھا - ریش و بروت چرا تراشیدی - انہوں نے اسی وقت شعر کہکر پڑھا ؎

ریش و بروت خویش تراشیدہ ایم ما	لیکن دل کسے نہ خراشیدہ ایم ما

چونکہ وہ امیر رکن بادشاہی تھا اور اہل عمل کے ہاتھ سے رنج و راحت ظلم و انصاف سب کچھ ہوتا رہتا ہے - وہ اسے طعن سمجھا - گفتگو بڑھنے لگی - قمر الدین خاں ڈرا کہ ادھر امارت کا غرور ادھر بے دماغی سے مجبور - ایسا نہ ہو کسی کا خون ہو جائے - نماز توڑ کر آیا اور محمد امین خاں سے کہا کہ آپ نے ان سے بھی ملاقات کی مرزا بیدل صاحب یہی ہیں - ادھر ان سے کہا کہ نواب سے ملاقات کیجئے وزیر الممالک بہت سخن فہم اور معنی شناس ہیں - غرض اس طرح رفع شر کروایا ؀

لطیفہ

شاعروں کا قاعدہ ہے کہ رات کو خلوت میں جب سب لوگ سو جاتے ہیں یہ اس وقت فکر سخن میں مصروف ہوتے ہیں - ایک دفعہ مرزا بیٹھے ہوئے شعر کہہ رہے تھے گھر میں چور آیا چونکہ اس وقت مضمون میں دل لگا ہوا تھا اس کے لطف میں ان کا جی نہ چاہا کہ ادھر متوجہ ہوں چور نے خاطر جمع سے گھر کا مال اسباب نکال کر سمیٹا - جب گٹھڑی باندھ کر لے چلا اس وقت خیال آیا کہ صبح کو اس بات کا چرچا ہوگا تو لوگ ہنسینگے کہ اس

ڈیل ڈول پر مرزا بیٹھے رہے اور چور گھر میں سے اسباب باندھ کر لے گیا۔ اپنی نولاسی اُٹھا کر ایسی اُس کی کمر پر ٹکائی کہ چور بچارا اسباب سمیت وہیں رہ گیا۔ صبح کو جب لوگوں کو خبر ہوئی تو بہت حیران ہوئے ؛

دیوان اور ساقی نامہ اور مثنوی محیط اعظم اور چار عنصر مجالس بیدل اور رقعات بیدل تصنیفات مشہور ہیں۔ بہت سی غزلیں مشکل قافیوں میں اور نئی نئی بحروں میں تصنیف کی ہیں۔ ۱۱۹۳ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ دہلی دروازۂ شہر دہلی کے باہر ان کی قبر ہے۔ تاریخ فوت یہ ہے ؎

آہ سرکردۂ اربابِ سخن	از غمِ آبادِ جہاں خورم رفت
گفت تاریخ وفاتش ہاتف	میرزا بیدل ازیں عالم رفت

دیوان ان کا بقلم جلی اور تقطیع بڑی۔ خوشخط لکھا ہوا قبر پر رکھا رہتا ہے ؛

نقل

ایک کابلی سوداگر انار ہندوستان میں بیچنے کو لایا۔ اتفاقاً سب انار اُس کے گل گئے۔ حیران ہو کر چند انار جو باقی تھے بطریق نذر مرزا کے پاس لایا اور عرض حال کیا۔ مرزا نے ایک شعر اُسے لکھ دیا اور نواب لطف اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بخیۂ کفشم اگر دنداں نما شد عیب نیست	خندہ دارد چرخ ہم بر ہرزہ گردی ہائے من

نواب اسے حسن طلب سمجھے کہ شاید مرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے اور نہایت غنیمت سمجھے۔ اُسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ میرزا نے کل روپیہ اُسی کابلی کو دے دیا ؛

خان آرزو میر عبدالولی سوزنی کی زبانی لکھتا ہے کہ ایک دفعہ میں مرزا کے عرس میں گیا۔ تمام شعرا شاہجہان آباد کے جمع تھے اور بموجب معمول کے کلیات ان کا نکال کر رحل پہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے فاتحہ پڑھ کے کہا کہ

خدا جانے مرزا کو بھی میرے آنے کی خبر ہوئی ہوگی یا نہیں۔ یہ کہہ کر میں نے دیوان کھولا تو دیکھا کہ سر صفحہ پر یہ شعر تھا ؎

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم	تو بر خاکم آئی و من مُردہ باشم

چند اشعار ان کے عام فہم بطریق انتخاب لکھے جاتے ہیں :-

رباعی

قومے بہ تمنائے زر و مال خوش اند	قومے بتماشائے خط و خال خوش اند
بیدل ہمہ را بہ حال بدمے بیند	خوش حال کسانیکہ بہر حال خوش اند
عبرتے گو تا لب از ہذیاں بہم دوزد مرا	خندہ ہا بسیار کردم۔ گریہ آموزد مرا
کیست از راہِ تو چوں خاشاک بردارد مرا	شعلہ جاروبی کند تا پاک بردارد مرا
در زیر چرخ یک مژہ راحت طمع مدار	آفت شناس سایۂ سقفِ خمیدہ را
مارا بہ غمِ عشق ہماں عشق علاج است	مہتاب بود پنبہ ناسور کتاں را
آب در ہر سرزمیں دارد جدا خاصیتے	نشہ باشد مختلف در ہر طبیعت بادہ را
زیں چمن با درد بیپائی قناعت کردہ ایم	جام گل تسلیم یاراں ساغر ما لالہ است
بگداز بر سنگے کہ پری داغ تو گردد	چوں سنگ اگر شیشہ برآئی چہ کمال است
عیشہا کردیم تا برباد رفت اجزائے ما	خانۂ ما بعد ویرانی برائے بام داشت
مارا کرم عام تو محتاج غنا کرد	گر جلوہ تغافل کند آہستہ گدا است
نیست نقشِ پا بہ گلزار خرامت جلوہ گر	دفتر برگ گل از دستِ بہار افتادہ است
دل عمرہاست آہستہ ترتیب دادہ است	مشقے نیاز جلوہ کہ ایں صفحہ سادہ است
شوق فسردہ از نگہے تازہ میشود	یک برگ کاہ شعلۂ واماندہ را عصا است
بخوان لذت دنیا گزند بسیار است	تر نجبینے اگر ہست بر سر خار است
اوج دولت سفلہ طبعاں را دو روزے بیش نیست	خاک اگر امروز بر چرخ است فردا زیر پاست
حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں	آنچہ ما در کار داریم اکثرش درکار نیست

غنی کشمیری

نام اس شاعرِ نازک خیال کا محمد طاہر اور غنیؔ تخلص ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس لفظ سے تاریخ اُس کی شروع شاعری کی بھی نکلتی ہے۔ محسن فانی کشمیری کا شاگرد ہے۔ اس تخلص نے اُسے ایسی تاثیر کی تھی کہ قناعت کی دولت سے دل بھی غنی ہو گیا تھا۔ باوجود بے سامانی کے نہایت آسودہ حالی سے گزران کرتا تھا۔ طبیعت اس کی بھی مشکل پسند تھی۔ کشمیر میں ایسا شاعر نازک خیال نہیں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے اس کا شہرہ سُن کر دہلی میں طلب کیا۔ آزاد مزاجی اور تخلص کی تاثیر نے اجازت نہ دی۔ آخر سیف خاں حاکم کشمیر کے نام فرمان پہنچا۔ اُس نے بلا کر فہمائش کی۔ غنی نے کہا آپ لکھ دیجیے کہ وہ دیوانہ ہے۔ نہیں آتا۔ حاکم نے کہا کہ بھلے چنگے آدمی کو دیوانہ کیوں کر لکھوں۔ غنی نے اُسی وقت کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اور خاک میں لوٹ کر دیوانوں کی طرح بھاگ گیا۔ لیکن چار دن کے بعد مر گیا۔ اور جس طرح شاعری میں استاد سے سبقت لے گیا تھا مرنے میں بھی سبقت کی یعنی عین جوانی میں مر گیا۔

اشعار اُس کے بہت تھے اور مضامین دقیق۔ محمد علی ماہر نے عام فہم اور اچھے اچھے چھانٹ کر دیوان مرتّب کیا۔ اسی واسطے اُسکے دیوان میں پوری غزل بہت ہی کم ہے۔ زندگی میں اُس کی دیوان مشہور نہ ہوا بعد مرنے کے ایران توران روم شام ہر جگہ پھیل گیا۔ گویا یہ شعر اُس نے خود پیش گوئی میں کہا تھا ؎

نہ گردد شعرِ من مشہور تا جاں در تنم باشد	کہ بعد از مرگِ آہو نافہ می آرد بروں بُو را

ایک شعر اُس کا مرزا صائب نے سُن کر بہت پسند کیا۔ اکثر پڑھا کرتا تھا اور باوجود اعلےٰ مرتبہ کمال کے کہتا تھا کہ تمام دیوان کے عوض میں ایک شعر مجھے دیتے مگر یہی دیتے ؎

حسن سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

خان آرزو یہ نقل لکھ کر کہتا ہے کہ علو حوصلہ اور طبع منصف کا مقتضا ہے نہیں تو صائب کا دیوان جو ایک دریاے ناپیداکنار ہے ایسے ایسے بہت اشعار اُس میں ہونگے ؛

نقل

غنی کا ایک شعر ہے کہ ؎

موے میانت شد اکرالہٖن	کردہ جدا کاسۂ سرہا ز تن

اور اکرالہٖن کشمیری زبان میں اُس تاگے کو کہتے ہیں کہ کمھار چاک پر باسن اُتارتے ہوئے لے کر بیٹھتا ہے اور اس سے کاٹ کاٹ کر اُتارتا جاتا ہے۔ جس نے سُنا وہ اس شعر کے معنوں میں حیران رہا۔ صائب نے سُن کر کہا کہ جوہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری ہے اور کسی کاٹنے کی چیز کو کہتے ہیں۔ آفرین ہے دونو کی طبعِ رسا کو اور واضح ہو کہ غنی کے تمام کلام میں یہی ایک کشمیری لفظ ہے جو اشعار فارسی میں داخل ہوا ہے۔ اس کا سبب بھی یہ ہے کہ ایک خاص مضمون اور نازک خیال اس کے سبب سے حاصل ہوا ہے ؛

نازک خیالی اور ایہام بندی جو شعراے ہند کا شیوہ ہے وہی اس کا بھی ہے۔ ایک دن شاہ محمد علی ماہر کے سامنے یہ مطلع پڑھا ؎

بے چراغیست اگر بزمِ خیالم غم نیست	مصرعِ ریختۂ شمعیست کہ در عالم نیست

ماہر نے ہنس کر کہا کہ فی الحقیقت مصرع ریختہ کسی شاعر نے کب کہا ہوگا۔ نازک مزاج بھی بہت تھا ؎

نقل

کہتے ہیں کہ عنایت خاں ولد مظفر خاں حاکم کشمیر نے ایک دن اثنائے گفتگو میں کہا کہ جو شعر ایک دفعہ پڑھنے سے سمجھ میں نہ آئے اُسے بے معنی کہنا چاہیئے۔ غنی نے اُسی دن سے ملاقات ترک کردی۔ شاہ ماہر نے اُس کے مرنے کی تاریخ بھی کہی ؎

چو واداش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی
غنی سر حلقۂ اصحاب او در نکتہ دانی شد

تہی چوں کرد بزم شیخ را گردید تاریخش
کہ آگاہی سوے ملک بقا از ملک فانی شد

اشعار

چو استعداد نبود کار از اعجاز نکشاید
مسیحا کے تواند کرد بینا چشم سوزن را

سواد کعبہ کے منظور ارباب نظر باشد
بہ سنگ سرمہ حاجت نیست ہرگز چشم سوزن را

ساقی بجام ریز مئے پرتگال را
ماہ تمام ساز بیک شب ہلال را

تا سرمہ داں سیاہیِ چشم تو دیدہ است
در چشم خویش میل ز سوزن کشیدہ است

یکموے فرق نیست میان دو ابروت
خوش مصرعے بمصرعِ دیگر رسیدہ است

سنگیں دل است ہر کہ بظاہر ملائم است
پنہاں درون پنبہ نگہ میپبہ دانہ را

ہر کس بدرگہِ کرمت بُرد تحفۂ
مارا ز دست خالی خود آستیں پر است

جز زیر خاک جاے من خاکسار نیست
روے زمیں ز مردم بالا نشیں پر است

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

آب بود معنیٔ روشن غنی
خوب اگر بستہ شود گوہر است

بگذر از خویش چو بینی دہن تنگ غنی
دل بہ ہستی چو نہی راہ عدم در پیش است

نمیشود سخن پست فطرتاں مشہور
بلند نیست صدا کاسۂ سفالیں را

ابوطالب کلیم

کلیم تخلّص ابوطالب نام رہنے والا ہمدان علاقۂ ایران کا تھا۔ یہ شاعر کامل ابتدائے عمر سے ذوق شاعری میں مبتلا تھا۔ جہانگیر کے وقت میں بعالم نوجوانی اوّل دکن میں اور پھر ہندوستان میں آیا۔ نورجہاں ملکۂ دوران (کہ طبع موزوں اور ذہن عالی رکھنے سے) اکثر اس سے اشعار میں ردّ و قدح رکھتی تھی۔ ایک دفعہ کلیم نے کہا ؎

زشرم آب شدم آب را شکستنے نیست	بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

نورجہاں نے کہا۔ یخ بستہ بشکست ؎

بعد اس کے ایران گیا اور پھر شاہجہاں کی سلطنت میں آیا ؎

توفیق رفیق طالب آمد (سنہ ۱۰۴۲ھ)

تاریخ اُس کی کہی اور اسی کے عہد میں رونق بازار پائی۔ حاجی محمد جان قدسی کے بعد ملک الشعرا ہوا۔ اور شاہجہاں نامہ میں ہے کہ کلیم ملک الشعرائی کے خطاب سے سرفراز تھا جو حاجی محمد جان قدسی آیا۔ اگرچہ حق ملک الشعرائی کا خطاب اُس کے لئے تھا۔ مگر چونکہ نام نکل گیا تھا اس لئے وہی مشہور رہا۔ بہرحال شیدا وغیرہ مُنہ زور شاعر حسد کے سبب سے کہتے تھے کہ وہ لوگ بڑے خوش نصیب تھے جنھوں نے کلیم کی ملک الشعرائی نہ دیکھی اگرچہ علوم رسمی سے بقدر ضرورت آگاہ تھا۔ مگر درحقیقت طبیعت موزوں اور ذہن رسا اور کلام میں لطف رکھتا تھا۔ اور علاوہ شعر کے تاریخ بہت خوب کہتا تھا۔ قیصر روم نے شاہجہاں کو نامہ لکھا کہ تم فقط بادشاہ ہند ہو

شاہجہاں کیونکر نام رکھا۔ بادشاہ اور تمام اہلِ دربار حیران ہوئے۔ کلیم نے یہ شعر لکھ کر پیش کیا ؎

ہند و جہاں ز روے عدد چوں برابر است	بر ما خطاب شاہِ جہاں زاں مسلّم است

اگرچہ جیسا اُس کا اعتراض تھا ویسا ہی جواب ہے کیونکہ نام میں معنیٔ لفظ سے چنداں غرض نہیں۔ اور اگر معنوں کا خیال کریں تو ہم عدد ہونے سے دو لفظ حکم میں برابر نہیں ہو سکتے۔ سپید اور سیاہ عدد میں برابر ہیں لیکن معنوں میں بالکل برخلاف ہیں۔ مگر چونکہ وہ زمانہ اسی طرح کا تھا لہذا بموجب حکم شاہی سونے میں تولا گیا ؛

کشمیر کی عمارات پر جا بجا اس کی کہی ہوئی تاریخیں کندہ ہیں۔ چشمۂ ورناک پر ۴۸ منزل کشمیر سے اس طرف جو عمارت ہے چشمۂ نہر پر یہ تاریخ کندہ ہے۔ ع

از چشمۂ بہشت بروں آمدہ است جوے

تخت طاؤس کی تعریف اور تاریخ میں اکبر آباد کی تعریف اور قحط سالی دکن اور صعوبتِ راہ کشمیر و تعریف بہار کشمیر میں مثنویات رنگین اور نہایت خوش آیند لکھی ہیں۔ اگرچہ ان تصنیفات سے مسافر یا مؤرّخ کو کچھ فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا لیکن نازک خیالی اُس کی جس کی زمانہ میں قدر تھی البتہ قابل دیکھنے کے ہے۔ افسوس ہے کہ اُس زمانہ کے صاحب کمالوں کو کام کے فائدۂ اصلی کی طرف خیال نہیں ہوتا تھا۔ دل لگی اور طبیعت کی خوشی کو دیکھتے تھے۔ اسی طرح شمشیر و سپر و قلمدان و چاقو و قطزن وغیرہ کی تعریف میں جدا جدا فصاحت کو بمضامینِ عالی صرف کیا ہے۔ ایک دفعہ بادشاہ مست ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھتا تھا۔ عالمگیر بارہ برس کا تھا۔ گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ جو ہاتھی کہ غالب آیا تھا وہ عالمگیر پر

حملہ آور ہوا۔ عالمگیر اپنی جگہ سے نہ ہٹا اور ہاتھی کے کان پر نیزہ مارا اور پھر تلوار سے بھی خوب داد مردانگی کی دی۔ کلیم نے اُس کا جنگ نامہ بہت تفصیل سے لکھا ہے اور اس مقام پر کہتا ہے ؎

سناں در تنِ تیرہ شد چوں نہاں | دگر بارہ در رفت آہن بکاں

انجام کو دُنیا سے ہاتھ اُٹھا کر کشمیر جنت نظیر میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ بادشاہ خدمت مہرداری کی دیتا تھا کہ مرتبۂ عالی اور کار معتبر ہے اس نے یہ شعر لکھ بھیجا ؎

چو مہرِ تو دارم چہ حاجت بہ مہرم
مرا مہرداری بہ از مُہرداری

مُدّت[1] تک کشمیر میں گوشہ نشین رہا آخر وہیں وفات پائی۔ غنی کشمیری نے تاریخ کہی ع طورِ معنی بود روشن از کلیم

شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ بادشاہ نامہ ہمارے نام پر نظم کرے چنانچہ اس کی نظم کے لئے کشمیر میں چند روز سکونت اختیار کی اور نامۂ زندگی اس کا وہیں دستِ قضا سے چاک ہوا۔

[1] سرخوش
مراۃ الخیال

اشعار منتخب

زتیغش چاک شد دل چوں نہاں سازد غم او را | گریباں پارہ شد گل را کجا پنہاں کند بو را
سخن در بہر زباں بے رحمتِ تعلیم میگوید | اگر طوطی بہ بیند یکرہ آں چشم سخن گو را

دُنبالِ اشک رفتم اگر یابم دلِ گم کردہ را | از خوں تواں برداشت پے نخچیر ناوک خوردہ را

ہر کس اگر بقدر ہنر بہرہ یافتے | بایستے آب بحر نصیب گہر شود

زخمہائے شانہ از زلفت فراہم میشود	بخت اگر یاری نماید مشک مرہم میشود
خندہ بدمستی است در ایام ما ہشیار باش	محتسب بو میکند ایجاد دہانِ بستہ را
بے دیدہ راہ اگر نتواں رفت پس چرا	چشم از جہاں چو بستی ازاں میتواں گزشت
دوست بہیچم فروخت با ہمہ یاری	یارہ فروشی دریں زمانہ ہمیں است
سرو را سایہ بکسے بیش نباشد یارب	ایں قدر خاک نشیں درتہِ آں بالا چیست
میانِ غمگساراں سوزم از غم	چو آں ماہی کہ در دریا بسوزد
اے جرس تا بکے از نالہ گلو پارہ کنی	کس دریں بادیہ دیدی کہ بفریاد رسی
حسن اگر بے پردہ باشد عشق از و دیوانہ نیست	بر چراغِ روز بالِ افشانیِ پروانہ نیست
اگر جدا ز تو مے را حلال میدانم	خدا بہ تیغ تو خوں مرا حرام کند
سربلند ہر کجا کمتر سلامت بیشتر	باد نتواند ستم بر سبزۂ نوخیز کرد
کلیم بخت تو آنگاہ میشود بیدار	کہ یار سر بکنارت نہادہ خواب کند
دل را خراب دارم تا بستگی نہ بیند	از قفل بے نیاز ہست تا خانہ در ندارد

خسرو کی طرح یہ شاعر باکمال بھی اکثر جگہ ہندی کے الفاظ استعمال کرجاتا ہے۔ مثلاً:-

زحسنِ شستۂ دو بی چہ گویم	وز آں بے پردہ محبوبے چہ گویم

محمد قلی سلیم

شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان میں آیا اور خوب نام پایا۔ اگرچہ وہ زمانہ ایسا ہنرور پرور تھا کہ اہل کمال بادشاہ کی ملازمت یا کسی امیر وزیر کی خدمت کا محتاج نہ ہوتا تھا مگر سلیم نے اسلام خاں کے توسل میں گزران کی۔ اس کا کلام صاف اور فصیح اور رنگین اور دلچسپ ہوتا ہے اور ہر شعر لطف سے خالی نہیں۔ تشبیہ میں کمال رکھتا تھا۔ اگرچہ کم گو تھا مگر خوش گو تھا۔ اس زمانہ کے مصنّف اور اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ سلیم اور لوگوں کے مضمون چرا چرا کر باندھ لیتا ہے۔ مگر پھر یہ بھی اکثروں نے لکھ دیا ہے کہ معلوم نہیں یہ بات کیونکر مشہور ہو گئی کیونکہ اشعار اُس کے اس طرح کے سُننے میں نہیں آئے۔ سچ ہے بد بھلا بدنام بُرا ۔

اشعار منتخب

تنہا نہ ہمیں زلف تو بسیار درازست
مژگان تو ہمچوں شب بیمار درازست

حاجت بگل ندارد آں گل کہ کجکلاہ است
درخواب حیف باشد چشمے کہ خوش نگاہ است

تا وجہ می نباشد نتواں سوئے چمن رفت
برمن نظارۂ گل دیدار قرض خواہ است

نو بہار است و چمن بر سر ساماں گل است
ابر روے ہوا دود چراغاں گل است

اشکم ز گفتگوے تو خاموش میکند | نامت نمی برم کہ دلم گوش میکند
نیک و بد زمانہ بروں کردہ ام ز دل | آئینہ ہرچہ دید فراموش میکند

بر سرم آمد ولے بسیار زود از من گزشت | دولتِ پیری کہ میگویند شمشیر تو بود

جوہر ذاتی ندارد احتیاجِ تربیت | صورت آئینہ را نقاش کے بردار کرد

در غمت نالۂ مرغِ چمن آید بیروں | اگر لب غنچہ کشائی سخن آید بیروں
از وجودم اثرے بسکہ ضعیفی نگزاشت
چوں حبابم نفس از پیرہن آید بیروں

حاجی محمد جان قدسی

سرخو

قدسی تخلّص محمد جان نام رہنے والا مشہد مقدس کا تھا اسی لئے قدسی تخلّص کیا تھا۔ غزل پردازی اور قصیدہ و مثنوی وغیرہ فنون شاعری میں کامل تھا۔ اکثر تذکروں میں اُسے حسّانِ زمان لکھتے ہیں۔ ظفر نامہ شاہجہان نظم شاہنامہ پر بڑی دھوم دھام سے لکھا ہے۔ یمین الدولہ آصف خاں جبکہ شاہجہاں کے عہد میں جہانگیر کے بعد مصلحت وقت کے لئے چند روز سلطان بلاقی خسرو کے بیٹے کو تخت نشین کر کے لاہور میں لایا۔ اس کے بیان میں کہتا ہے ؎

مداں عیب نزویرِ والا گہر	بود آب در شیر گوہر ہنر

عبداللہ خاں زخمی کہ ہفت ہزار سوار اور منصب ہفت ہزاری رکھتا تھا۔ جب اُس کا ذکر کسی مقام پر آیا ہے تو چونکہ نام اُس کا بحر میں نہیں آسکتا۔ اس طرح بیان کرتا ہے ؎

نہنگے کہ از غایت احتشام	نہ گنجد بہ بحر بزرگیش نام

اس طرح کی صدہا نزاکتیں اور لطافتیں اُس میں پیدا کی ہیں کہ لطف اُن کا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

ایک سوداگر نے فیل سفید بادشاہ کی نذر گزرانا۔ تہنیت سواری میں کہتا ہے۔ رباعی

بر فیل سفیدت کہ مبیناد گزند	شد شیفتہ ہر کس کہ نگاہے افگند
چوں شاہجہاں براو برآمد گوئی	خورشید شد از سفیدۂ صبح بلند

منتخب التواریخ

نو کروڑ روپیہ کی تیاری میں جب تخت طاؤس مرتب ہوا سب نے قصیدے اور قطعات اور تاریخیں کہیں مگر قدسی کی تاریخ پسند آئی۔ اور مینائے سبز سے اندر گنبد کے لکھی گئی ؎

	چو تاریخش زباں پرسید از دل	
۱۰۴۴ھ	بگفت اورنگ شاہنشاہِ عادل	

کشمیر کی بہار اور راہ ناہموار کے باب میں مثنوی دلچسپ لکھی ہے۔

ایک دفعہ جہاں آرا بیگم دختر شاہجہاں کے لباس میں شمع سے آگ لگ گئی۔ اس باب میں کہتا ہے ؎

تا سرزدہ از شمع چنیں بے ادبی	پروانہ زعشق شمع واسوختہ است[1]

منتخب

واضح ہو کہ ۱۰۵۳ھ میں جبکہ بادشاہ دکن میں تھا یہ حادثہ پیش آیا۔ بیگم مذکور کو اس قدر صدمہ پہنچا تھا کہ زندگی کی امید نہ تھی۔ اتفاقاً ڈاکٹر بوٹن صاحب ان دنوں وارد مدراس تھے۔ ان کے علاج سے نہایت جلد بیگم مذکور نے شفا پائی۔ بادشاہ نے بہت کچھ انعام دینا چاہا تھا لیکن اس عالی ہمت نے اس کے صلہ میں فقط اس بات کی اجازت چاہی کہ ہماری قوم کو ممالک بنگال میں اجازت کوٹھی کھولنے کی ملے۔

قدسی نے ایک سفر میں عبداللہ خاں مذکور کی تعریف میں قصیدہ کہکر سنایا۔ عبداللہ خاں مسند سے اٹھ کھڑا ہوا اور دونو ہاتھ پکڑ کے قدسی کو اپنی جگہ پر بٹھایا۔ آپ لباس شب خوابی سے پالکی میں سوار ہو کر لشکر سے باہر نکل گیا۔ تمام مال و اسباب خیمہ و خرگاہ اسے دے دیا۔

چند روز کے بعد ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں کہا۔ بادشاہ بھی بہت خوش ہوا اور کہا کہ جو انعام عبداللہ خاں نے تمہیں دیا کوئی نہیں

[1] یعنی بیزار و برگشتہ ہو گیا ہے۔

دے سکتا۔ لیکن سات دفعہ جواہرات سے منہ بھروایا۔ سونے کا طبق اُس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ خزینہ دار منہ میں جواہر بھرتا تھا اور وہ طبق میں اُگلتا جاتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری شاہجہان نامہ میں لکھتا ہے کہ روز جشن ۱۰۴۵ھ جلوس کے دن قدسی نے قصیدہ پڑھا اور بادشاہ نے اُسے سونے میں تُلوایا چنانچہ ایک من ۱۸ سیر ہوا ٭

ایک دن کسی ملّا کے سامنے اپنی غزل پڑھ رہا تھا۔ جب یہ شعر پڑھا ؎

ساقی بہ صبوحی قدرے پیشتر از صبح
ہر چیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

ایک لڑکا اُسی مکتب میں بیٹھا تھا بے اختیار بول اُٹھا کہ بجائے قدرے صبح کے اگر نفسے صبح ہوتا تو بہت مناسب تھا۔ چونکہ منصف آدمی تھا قدسی نے بھی اس اصلاح کو تسلیم کیا اور کہا کہ یہ فیضانِ الٰہی ہے۔ علم و ہنر یا مشق پر منحصر نہیں ٭

سوائے تصانیف مذکورہ کے اور کسی علم میں کوئی کتاب اُسکی نہیں۔ افسوس ہے کہ یہ طبیعتیں عالی ان لوگوں کی بیجا صرف ہوئیں اور ذہن ہائے رسا سے کوئی نتیجہ ایسا نہ نکلا جو مفید خاص و عام ہوتا۔ اگر یہ لوگ علوم مفیدہ حاصل کرتے اور عمل کی مشق کو اُس میں ترکیب دیتے اس میں شک نہیں کہ ایجادات عجیب و غریب یادگار چھوڑتے۔ لیکن ترقی اس امر کی حاکم وقت کی توجہ پر منحصر ہے۔ چونکہ اُس زمانہ میں انہیں بے مصرف چیزوں کی قدر تھی اس واسطے ان لوگوں کے ذہن بھی اُسی طرف متوجہ ہوئے۔ شاہجہاں کے ایام سلطنت میں قدسی فوت ہوا اور بعد اُس کے کلیم ملک الشعرا ہوا ٭

چند شعر منتخب اُس کے لکھے جاتے ہیں :-

رباعی

هر کس که سخن ز قدر و مقدار کند	کے حالتِ خود تواند اظہار کند
خواہی ہنرت عیان شود پستی جو	شمشیر فرود آید و ہم کار کند

تمہید قصیده

من آں نیم که کنم سرکشی ز تیغ جفا	چو شمع زنده سر خویش دیده ام بر پا
دمے که بگذرم بے کرشمۂ ساقی	نفس کند بدلم کار ریزۂ مینا
کسے که لذّتِ پیکانِ بے نشانی یافت	دگر نشد به نشاں آشنا چو تیر خطا
نه غم بسینه نه پیکاں بدل نه خار به پا	بتنگ عیشی من کس مباد در دنیا
شبے که عقده کشایم بیاض از مویش	چو شمع جاں بسر انگشتم آید از اعضا
برائے زینتِ مژگاں بدیده خواہم خوں	دگر نه برکف دریا کسے نه بسته حنا
بآب خود چو زمرد کسے که سبز بود	نه شان ابر شناسد نه شوکتِ دریا

تمہید قصیده

اے مرا بے رخت افتاده دو عالم ز نظر	مردم چشم مرا خاک رہت نور بصر
خطِ رخسار تو با خویش طلسمے دارد	که تواں خواندنش از رو نتواں کرد از بر
بحر با دستِ تو منشورِ سخا می طلبید	ہمه گفتند که بر آب نویسد محضر

گر کند نامیه را منع نباید بیروں
غنچه از شاخ چو پیکانِ محبت ز جگر

زود به گردم منِ بے صبر داغِ خویش را	اوّل شب میکشد مفلس چراغِ خویش را

عیش این باغ باندازهٔ یک تنگدل است
کاش گل غنچه شود تا دلِ ما بگشاید

درچنین فصلے کہ بلبل مست و گلشن پرگل است
گر ہمہ پیمانۂ عمر است خالی خوب نیست

سرنوشتم را قضا از بس پریشان زد رقم
ہر کہ دیدش گفت مضمونے درین مکتوب نیست

کند چو حرف گرفتاریٔ مرا تحریر
بپاے خامہ سزد گر رقم شود زنجیر

غلام ہمّت درویشیم کہ بے منت
نشاند آتش حرصِ مرا بموج حصیر

گذشتنم ز تو باشد چو رشتۂ سوزن
کہ با حریر بود گرچہ بگذرد ز حریر

در دل من زخم آبلہ می رویدخار
گلشنم تازہ بود بے مددِ ابرِبہار

جوہر ذات تہی دستیٔ جاوید آرد
چوں ترا تجربہ حاصل نشد از دستِ چنار

بیم نقصاں بود آنرا کہ کما یا دارد
میوہ چوں پختہ شد از شاخ بریزد ناچار

عاشقاں را بدو محراب حرام است نماز
قبلۂ طاعتِ محمود بابروے ایاز

یاد روے تو بخاطر رسد از دیدنِ گل
ہیچ راہے بحقیقت نبود بہ ز مجاز

رشک بر زندگیٔ خضر ندارم بجز این
کہ نشاں از سرِ زلفِ تو دہد عمر دراز

من نمیگویم بچشم نہ قدم یا بر زمیں
چشمِ من فرش است ہر جا می نہی پا بر زمیں

کشتیٔ چشمِ تر من بود با دریا بدر
اشک زور آورد آمد پشت دریا بر زمیں

جا بود افتادگانِ عشق را بر آسماں
من ہم از افتادگانِ عشقم اما بر زمیں

آنکہ ہرگز بر نمیدارد قدم از چشمِ من
جبہئے دارم کہ نقشِ پاے او بر خاک چسپ

دل بہ زلفش بستۂ قدسی چہ میخواہی دگر	صید بسمل گشتہ را معراج جز فتراک چیست

از مثنوی

ز پیوستن خلق بگسسر بہ	ز پیوند ہر شاخ روید گرہ
مپیوند با ہیچکس زینہار	کہ ناقص بود ظرف پیوند دار
ز قطع تعلق چہ بہتر بود	گل خندہ را جائے بر سر بود

سرمد

نام اس کا کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اکثر مصنّف حکیم سرمد لکھتے ہیں۔ اور اہل تصوّف اس کو ولی خیال کرتے ہیں۔ فرنگستان یا ارمن سے بلباس سوداگری وارد ہندوستان ہوا۔ شہر پٹنہ میں ایک ہندو بچہ پر عاشق ہوا۔ دولت دُنیا کے ساتھ دولت ننگ و ناموس اور جوہر عقل و تمیز بھی کھو بیٹھا بلکہ پابند لباس کا بھی نہ رہا اور پھر ہندوستان سے نہ گیا۔ بعض اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ یہودی تھا اور توریت وانجیل کو با تفسیر جانتا تھا اور خوب جانتا تھا۔ بہرصورت آزادانہ حالت میں گزران کرتا تھا اور خوش رہتا تھا۔ سبحان اللہ اگر ایسا موقع ہاتھ آجائے تو اس سے بہتر کیا ہے۔ زمانہ اچھا پایا تھا کہ اس حالت میں بھی اچھی گزرتی تھی اور احتیاج پردہ فاش نہ کرتی تھی۔ آج ہوتا تو معلوم ہوتی۔ شاہجہاں کا عہد تھا۔ دارا شکوہ کو تصوّف کا شوق اور دیوانہ مزاج لوگوں

سے اعتقاد تھا اس لئے دونو کی خوب گھٹتی تھی۔ ایک دن شاہجہاں کے سامنے بھی اس کی تعریف کی۔ بادشاہ نے عنایت خاں آشنا کو بھیجا کہ جاکر ملے اور اس کے کشف و کرامات کا حال آکر عرض کرے۔ اُس نے وہاں سے آکر یہ شعر پڑھا ؎

بر سرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است از و کشف عورت است

یہاں تک کہ ۱۰۶۹ہجری میں جبکہ عالمگیر بادشاہ نے تخت ہندوستان پر تسلط پایا تو اور انتظاموں کے ساتھ اس پر بھی متوجہ ہوا۔ خلاف شرع امورات سے منع کرکے کپڑے پہننے کی بھی تاکید کی اور انجام یہ ہوا کہ ۱۰۷۱ہجری میں شہر دہلی میں مسجد جامع کے سامنے خاص بازار کی جانب قتل ہوا۔ اس موقع پر بڑا بہانہ قتل کا یہ رباعی تھی کہ جس سے معراج کا انکار ثابت کیا۔ رباعی

آنکس کہ سرّ حقیقتش باور شد
خود پہن تر از سپہر پہناور شد
مُلّا گوید کہ بر فلک شد احمد
سرمد گوید فلک باحمد در شد

اس میں بھی شک نہیں کہ داراشکوہ کے سبب سے عالمگیر کو اس کے ساتھ دل میں غبار تھا۔ ورنہ اگر صاف دل سے دیکھیں تو یہ مضمون باعتبار شاعری کے ایک ادّعائے شاعرانہ ہے۔ اور اہل تصوّف کے کلام میں دیکھیں تو بھی اسی طرح ہزاروں مضامین ہیں۔ جو لوگ ان باتوں کا مذاق رکھتے ہیں وہ تو بہت کچھ حکایتیں اور روایتیں اس باب میں بیان کرتے ہیں لیکن بعض لطیفے البتہ لطف سے خالی نہیں ؛

لطیفہ

کہتے ہیں قاضی اور محتسب وغیرہ جو اُس وقت میں روز و شب

ناجائز باتوں کی تلاش اور ممانعت میں سرگرم تھے ایک اُن میں قاضی عبدالقوی بھی تھے اور خاص و عام میں قاضی قوی مشہور تھے وہ اکثر سرمد کے گرد رہتے تھے۔ اور اس کے لئے مخبر لگا رکھے تھے۔ ایک دن ایسے وقت آن لیا کہ پیالہ بنگ کا اس کے ہاتھ میں تھا چاہتا تھا کہ پیئے جو قاضی صاحب آپہنچے۔ کہا کہ او فقیر کیا پیتا ہے۔ سرمد نے کہا بابا جنگل کی بوٹی ہے۔ قاضی نے کہا کہ بنگ نشہ کی چیز ہے۔ اس کا پینا حرام ہے۔ تجھ پر حدِ شرع جاری کی جائیگی۔ سرمد نے قاضی کے پائجامے کا کپڑا چٹکی میں پکڑ کے کہا کہ بابا یہ کیا چیز ہے؟ قاضی سمجھ گیا اور کہا کہ البتہ ریشمی کپڑا پہننا جائز نہیں مگر اس میں ریشم اور سوت ملا ہوا ہے اسی واسطے اسے مشروع کہتے ہیں۔ سرمد نے کہا کہ بابا آخر اس ٹھنڈائی میں بھی تو سونف کالی مرچیں اور کئی اور چیزیں ہیں ؎

لطیفہ

ایک دن سرمد ننگا بازار میں چلا جاتا تھا۔ قاضی کے پیادے پکڑ لے گئے۔ قاضی نے کہا کہ فقیر یہ کیا حرکت ہے کپڑے کیوں نہیں پہنتا۔ کہا کہ بابا کیا کروں شیطان قوی ہے ؎

عبرت

سرخوش کہتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل دلی کی جامع مسجد میں حوض کے کنارے پر بیٹھے شعر پڑھ رہے تھے۔ کہ سامنے سے سرمد آیا۔ ہمیں دیکھکر ہنسا اور یہ شعر پڑھا

دیرا ست کہ افسانۂ منصور کہن شد	اکنوں سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

چنانچہ اس کے دُوسرے ہی دن قتل ہوا۔ یارانِ جلسہ اُس سے یہ بیت سُن کر بہت محظوظ ہوئے اور اثنائے شعر خوانی میں پھراُس سے شعر کی فرمایش کی تو اُس نے یہ شعر پڑھا ؎

سر جُدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصّہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

کہتے ہیں کہ جب جلّاد شمشیر بکف اُس کے سامنے آیا تو اُسے دیکھ کر کہا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا می شناسم۔ اور یہ شعر پڑھکر گردن جُھکا دی ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

بہرحال خیالات اُس کے لطفِ کیفیت سے خالی نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

دوش در آغوش شبنم خفتی اے گل تا سحر
ناز بر بلبل مکن دیگر کہ تردامن شدی

رباعیوں میں بہت اچھّے اچھّے خیالات باندھے ہیں۔ رباعی

سرمد غم عشق بُلہوس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

رباعی

سرمد اگرش وفاست خود می آید
بیہودہ چرا درپئے او میگردی
گر آمدنش رواست خود می آید
بنشیں اگر او خداست خود می آید

رباعی

سرمد گلہ جو نشد نکو شد کہ نہ شد
منّت کشِ دہر میشدی آخر کار
لب بیہُدہ گو نشد نکو شد کہ نہ شد
کار بکہ نکو نشد نکو شد کہ نہ شد

رباعی

سرمد جسمیست جانش در دست کسے ست   نامیست ولے نشانش در دست کسے ست
میخواست که مرغے شده از دام جهد   گاوے شده ریسمانش در دست کسے ست

رباعی

سرمد که ز جام عشق مستش کردند   بالا نبروند و باز پستش کردند
میخواست خدا پرستی و ہشیاری   مستش کردند و مے پرستش کردند

دلی کی جامع مسجد کے سامنے ہی اس کی قبر ہے اور اب تک سال بسال وہاں عرس ہوتا ہے۔

رباعی

سرمد گله اختصار می باید کرد   یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے یار می باید داد   یا قطع نظر ز یار می باید کرد

رباعی

سرمد تو حدیث کعبه و دیر مکن   در کوچهٔ شک چو گمرہاں سیر مکن
رو راہروی ز شیطاں آموز   یک قبله گزین و سجدهٔ غیر مکن

رباعی

آنکس که ترا کار جہانبانی داد   ما را همه اسباب پریشانی داد
پوشاند لباس ہرا عیبے دید   بے عیباں را لباس عریانی داد

رباعی

احوال شد از زشتیٔ اعمال تباه   جز فضل خدا نیست دگر جائے پناه
ہر چند که من ضعیف و ابلیس قوی ست   لا حول ولا قوة الا بالله

رباعی

یاراں چه قدر راه دو رنگی دارند   مصحف به بغل دین فرنگی دارند
پیوسته بہم چو مہرہائے شطرنج   در دل همه فکر خانه جنگی دارند

آبروی متقدمین و فخر متاخرین مولانا شیخ علی حزین

حزین تخلص محمدؐ علی نام ابن ابی طالب - بزرگ اس کے نہایت بزرگ - خاندان اُس کا عالی - فارس میں سلاطین و امرا کے درباروں میں واجب التعظیم تھا - سوانح عمری اپنا جو اُس نے خود لکھا مشہور و معتبر کتاب مقدار میں گلستاں سے کچھ زیادہ ہے - ولایت انگلینڈ کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے - اُس کی خوبیٔ عبارت اور حسن مطلب کے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں - احوالات کا خلاصہ اُسی نسخہ سے لکھا جاتا ہے ٭

واضح ہو کہ اصل اُس کی گیلان سے تھی - بزرگ اُس کے لاہجان میں آکر آباد ہوئے - آبا و اجداد اُس کے بھی فاضل اور صاحب تصنیف تھے - علوم عقلی و نقلی میں بڑی بڑی کتابیں اُن کی تصنیف ہیں ٭

شیخ ۱۱۰۳ھ ہجری میں دارالسلطنۃ اصفہان میں پیدا ہوا - حافظہ اس قدر صحیح تھا کہ عالم شیرخوارگی کی باتیں بڑھاپے تک یاد رہیں - ۴ برس کی عمر میں پڑھنے بیٹھا دو برس میں لکھنے پڑھنے لگا - ابتدا سے علم کا ایسا شوق تھا کہ پڑھنے کے سوا کسی بات کا خیال نہ تھا - فارسی کی نظم و نثر کی بہت کتابیں دیکھیں اور چند رسالے فقہ منطق اور حکمت کے پڑھے - اسی عمر میں یہ حال تھا کہ شعر سُن کر جی بے اختیار ہو جاتا تھا - خود بھی جو کچھ مُنہ میں آتا کہتا تھا مگر باپ اور اُستاد کے ڈر سے چھپاتا تھا اور اُن کے منع کرنے پر خیال کر کے چھوڑنے کا ارادہ کرتا تھا - پر اصلی شوق ایسا غالب تھا کہ چھوٹ نہ سکتا تھا - رفتہ رفتہ فقہ منطق معانی بیان حدیث وغیرہ

کی سب کتابیں اُس نے پڑھیں۔ اکثر اُن میں سے خود باپ نے پڑھائیں وہ بھی فاضل تھا۔ پانچہزار کتاب اُس کے کتب خانہ میں موجود تھی کہ بہت اُن میں سے خود اُس کی لکھی ہوئی اور صدہا کتابیں اول سے آخر تک اُسکے قلم کی تصحیح کی ہوئی تھیں چونکہ اُس کا باپ بزرگ خاندان اور رئیس اور نیک اطوار تھا اس واسطے فضلا و شعرا و صاحب کمال اُس کے پاس جمع ہوتے تھے۔ شیخ کو سامان تحصیل کمالات کا اور صحبتیں شایستہ حاصل ہوتی تھیں بعد ازاں علم اخلاق اور تہذیب نفس اور صفائیِ دل پر متوجہ ہوا اور اس سے بہرۂ کافی حاصل کیا۔ علم ہیئت کا شوق ہوا اور انتہا تک کتابیں اُس کی دیکھیں۔ شوق علم میں دن رات اس قدر جانکاہی سے مصروف تھا کہ دیکھنے والے رحم کھاتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں اُسے شوق طب کا ہوا ایک شب کتاب دیکھتے دیکھتے صبح ہوگئی۔ آخر شب باپ بھی اُس کے پاس آنکلا۔ دیکھ کر رویا اور کہا کہ بیٹا میں دیکھتا ہوں کہ تجھے علم کا شوق حرص کے مرتبے کو پہنچ گیا ہے۔ عمر تھوڑی اور ہوس بہت۔ جسم تیرا ایسی محنت کا متحمل نہیں۔ یہ شوق تجھے ایسا کھائے جاتا ہے جیسے تیز تلوار اپنے میان کو کھاتی ہے اور تجھے معلوم نہیں ہوتا اپنے حال پر رحم کر اور ایسے خیالات سے درگزر۔

ماں باپ نے ہرچند چاہا کہ اپنے سامنے اُس کی شادی ہو جائے مگر اس کے شوق علم اور طبع آزادانہ نے اجازت نہ دی۔ اسی حال میں عبادت الٰہی اور ریاضت اور شب بیداری سے بھی غافل نہ رہتا تھا۔ گو کہ دیندار تھا۔ لیکن تعصب اُس کے کلام سے کہیں نہیں پایا جاتا۔ ساتھ استعداد کے ذہن رسا تھا۔ فقہ کے مسئلوں کے اختلاف دیکھ کر صبر نہ کرسکا اور خود حدیث کی کتابیں دیکھ کر مرتبہ اجتہاد کا حاصل کیا۔ اس حال میں بھی شاعری کا شوق ویسا ہی گریباں گیر تھا۔ چنانچہ ایک دن اُس کے باپ کے ہاں

مجمعِ اہلِ کمال تھا۔ ایک شخص نے محتشم کاشی کا شعر پڑھا ؎

اے قامتِ بلند فدائے درکمندِ تو	رعنائی آفریدہ قدِ بلند تو

حزیں نے بجائے قامت کے لفظ گردن سے اصلاح کی۔ باپ نے کہا کہ میں جانتا ہوں تم اب تک شاعری سے باز نہیں آئے۔ اگر کہہ سکتے ہو تو کچھ اس طرح میں کہو اُس نے فی البدیہہ یہ کہا ؎

صید از حرم کشد خمِ جود بلند تو	فریاد از تطاولِ مشکیں کمند تو

سب لوگ حیران ہو گئے اور ابھی آوازِ تحسین موقوف نہ ہوئی تھی کہ اُس نے کہا ؎

اے رشک طور زآمدنت کوی عاشقاں	بنشیں کہ باد خوردۂ جانہا سپند تو

سب لوگ اُچھل پڑے اور بہت تعریف کی۔ اُس نے یہ شعر اور پڑھا ؎

مشکل شد است کارِ دل از عشق و خوشدلم	شاید رسد بخاطرِ مشکل پسند تو

اس پر تو باپ بھی بے اختیار ہو گیا اور اُس نے اسی طرح غزل تمام کی۔ سب اس بدیہہ گوئی سے حیران ہو گئے۔ باپ نے یہ غزل لکھنے کو قلمدان دیا اور دے دیا بلکہ کہا آج سے میں نے تجھے شعر کہنے کی اجازت دی کہ خدا نے تجھے طبیعت اس کے قابل دی ہے۔ مگر یہ شرط ہے کہ اب اس میں وقت ضائع نہ کیا کرنا۔ اُنہیں دنوں فصل بہار کی تھی۔ گلگشت میں گھوڑے سے گر کر اُس کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور برس دن تک بیمار رہا مگر اُس حال میں بھی شعر کہے جاتا تھا۔ چنانچہ ایک ساقی نامہ ہزار شعر کا لکھا جس کا سرکلام یہ ہے ؎

خدایا توئی واقف از راز و بس	بہشت از تو دارند پاکاں ہوس
من و مستی و کنجِ میخانہ	بآزادیم خطِ پیمانہ

بعد ازاں سیاحی شروع کی اور ہر ملک کے عالموں اور صاحب کمالوں سے تحصیل علوم مختلفہ کی کرتا رہا۔ علمائے یہود و نصاریٰ سے ملاقاتیں کیں اور انجیل اور توریت مع شرح کے اُن سے پڑھیں۔ جس مذہب کا

کوئی عالم ملتا تھا اُس سے نہایت شوق سے ملاقات اور خفیہ تحقیقات کرتا تھا۔ دستور نام آتش پرست سے بہت صحبت رہی اور کتابیں زند و اُستا کی پڑھیں اور اکثر مذہب کی کتابوں پر رسالے اور حواشی بھی خود لکھے۔ ممالک فارس میں کوئی شہر ایسا نہیں جس کی اُس نے بخوبی سیر نہ کی ہو۔ حج بھی کیا اور زیارات مشہورہ اور غیر مشہورہ بزرگوں کی بہت اعتقاد سے حاصل کیں۔ کئی برس کربلائے مُعلّے میں رہا۔ اپنے ہاتھ سے ایک قرآن لکھ کر وہاں چڑھایا اور وہاں ایسا کتب خانۂ عالی دیکھا کہ کسی شہر میں نہ دیکھا تھا۔ ہزارہا عجیب و غریب کتابوں کی وہاں سیر کی۔ بندر مسقط اور بندر عباس کے سفر میں صدمہ طوفان کا بھی اُٹھایا اور رستم مجوسی کی ملاقات بھی حاصل کی وہ مسائل ہیئت اور رصدیہ میں مہارت کلّی رکھتا تھا۔ اُس کے پاس رصد اشمرت مجوسی کی دیکھی گئی مگر اُس کے اکثر اصول غلط تھے۔ چنانچہ اُس نے سیّاروں کی گردش کا حساب کیومرث کی پیدائش سے شروع کیا ہے۔ اُن کے نزدیک وہی آدم اوّل ہے اور اُسے اس وقت تک چار ہزار برس سے زیادہ گزرے ہیں مگر یہ امر خالی تعجب سے نہیں۔ اگرچہ متانت طبع کے سبب سے اُس نے خود مفصل نہیں لکھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آغاز جوانی میں کہیں عاشق بھی ہوا تھا۔ اُسی عالم میں ایک دیوان مُرتب کیا اور اہل کمال میں مقبول ہوا جس کی تفصیل فہرست مضامین میں لکھی جائیگی ٭

نقل۔ اُس نے شہر لار میں ایک شخص کو دیکھا کہ چھری ہاتھ میں لئے زخم کاری اپنے بدن پر مارتا ہے اور مرنے لینا چلا جاتا ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ وہ دیوانہ کسی پر عاشق تھا معشوق اُس کا اجل کو منظور نظر ہوا۔ یہ اُس کے مرنے کی خبر سُن کر پہلے تو غش ہو گیا۔

ہوش میں آیا تو جنون تھا۔ اب چند روز سے یہ حال ہے۔ کئی دفعہ لوگوں نے چاہا کہ اُسے پکڑ کر چھُری چھین لیں۔ ایک دفعہ زمین پر پچھاڑ کر زبردستی بھی کرنی چاہی۔ اُس وقت اُس نے ایسی عجز و زاری کی کہ سب کو یقین ہوا کہ اگر چھُری چھین لینگے تو مر جائیگا۔ اتفاقاً تین دن بعد اُس کے پیٹ میں ایک ایسی چھُری کاری لگی کہ انتڑیاں نکل پڑیں اور وہ بچارا مر گیا۔ شیخ نے اُس وقت یہ رباعی کہی ؎

آنانکہ غم عشق گزیدند ہمہ	در کوے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح از عشق است	باآنکہ سپاہ او شہیدند ہمہ

سنہ ۱۱۳۵ ہجری میں جب اُس کی عمر ۳۲ برس کی تھی تو جو نکتہ ہائے باریک اور تحقیقات اور حالات عجیب و غریب اُسے سیر و سفر میں حاصل ہوئے تھے لکھ کر ایک مجلد جمع کیا۔ مگر جب افغانوں نے شیراز پر چڑھائی کی تو ساتھ کتب خانہ کے وہ بھی لُٹ گیا۔ خود لکھتا ہے کہ جب تک زندہ ہوں اُس کا افسوس رہیگا۔ اگر وہ رہتا تو ایک تحفہ قابل خزانہ سلاطین کے ہوتا۔ اب اُسے شوق گوشہ نشینی کا اور دنیا سے بیزاری ہونے لگی۔ جہاں سبزہ زار اور آب جاری اور دامن کوہ دیکھتا وہیں پہنچتا اور بیٹھ رہتا۔ مگر دوست آشنا پھر جا پہنچتے اور لے آتے۔ اس کے علاوہ محبت والدین کی بھی نہ بیٹھنے نہ دیتی۔ چند سال کے بعد دوسرا دیوان مرتب کیا اور مثنوی تذکرۃ العاشقین لکھی جس کی ابتدا یہ ہے ؎

ساقی ز مئے موحدانہ	ظلمت بر شرک از میانہ
باتیرہ دلاں چو لمعۂ نور	در نیم شباں تجلی طور
دردہ کہ ز خود کرانہ گیریم	بیخود رہ آں یگانہ گیریم

اُس میں اصمعی کی روایت سے ایک حکایت نقل کی ہے کہ اُس نے

سفر حج میں ایک پتھر پر یہ شعر خون سے لکھا ہوا دیکھا ؎

الا معشر العُشاق باللہ خبّرُوا	اذا اشتدّ عشق بالفتیٰ کیف یصنعُ

سنہ ۱۱۲۷ ہجری میں اُس کا باپ مرگیا۔ بہت افسوس کیا اور اُس کے غم میں مرثیہ کہا۔ دو برس کے بعد ماں مرگئی۔ دادی اور دو بھائی گھر میں رہے لیکن اُن کی غمگساری اور محبت و شفقت کا بہت شکرگزار رہے۔ اس عالم میں بباعث جوشش غم کے طبع موزوں سے بہت اشعار پُرتاثیر وارد ہوئے اور تیسرا دیوان مُرتّب ہوا۔ مگر دنیا سے بیزاری اور شوق گوشہ گزینی کا زیادہ ہوگیا۔ بباعث اپنی عدم پیروی اور بےانتظامی ملک کے املاک جس پر گزران منحصر تھی رفتہ رفتہ بالکل جاتے رہے۔ جبکہ افغانوں نے ایران پر تسلّط کیا شیخ نے بہت نقصان اور سخت تکلیف اُٹھائی۔ تمام کتب خانہ غارت ہوگیا۔ اُس وقت سلطان حسین صفوی بادشاہ تھا۔ سرگردانی سفروں کی بھی زیادہ تر بباعث آشوب افغانی و حملہ ہائے رومی و روسی کے تھی۔ عربستان کا سفر کیا اور خوب سیاحت کی۔ دانشمندی اور معاملہ فہمی اُس کی اس سے قیاس کرنی چاہئے کہ ایک جگہ بےانتظامی اور ملک کی بےبند و بستی کی شکایت میں کہتا ہے کہ آج دنیا بادشاہ باتدبیر سے بالکل خالی ہے مگر انگلیس ایک طائفہ ہے کہ وہ لوگ امور معاش اور ضبط ممالک میں صاحب سلیقہ معلوم ہوتے ہیں۔ بندر عباس اور مسقط میں اس فرقہ کے لوگوں سے صحبت حاصل ہوئی وہ اس صاحب فضل و کمال کو بہت غنیمت سمجھتے تھے اور ہمیشہ خود اس کے پاس آتے رہتے تھے۔ بعد سلطان حسین کے اُس کا بیٹا شاہ طہماسپ بادشاہ ہوا۔ ایسے نازک وقت میں اُسے نظام مملکت میں صلاحیں نیک دیتا رہا۔ اگر وہ سفر میں ہوا تو بھی شاہ اور اُس کے

ارکانِ دربار نے ایسے امورات میں اُس سے خط و کتابت جاری رکھی۔ وہ مستغنی و بے نیاز کسی بادشاہ کی مصاحبت اور ندیمی کی طرف مائل نہ ہوا اور اسے سخت حقارت سمجھتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کسی کو مظلوم نہ دیکھ سکتا تھا۔ جس کو ظلم رسیدہ دیکھتا تھا اگر مقابل میں حاکم بھی ہوتا تو خود جاکر سینہ سپر ہوجاتا اور جہاں اپنی بات پیش جاتی نہ دیکھتا وہاں سے نکل جاتا۔ بباعث اُس کی نیک نیتی اور عالیمقداری کے حاکم و محکوم اُس کی بات نہایت عظمت و احترام سے سُنتے تھے۔ کوئی شہر اُس کے عقیدت مندوں سے خالی نہ تھا۔ صاحب تدبیر اور ہر دل عزیز ایسا کہ اکثر ملکوں کے فسادوں کو بے حاکم کے رفع کیا۔ اپنی بے تعصب دینداری اور سلامت روی اور جوہر کمالات سے ایسا مقبول خلایق تھا کہ جہاں جاتا تھا وہاں کے لوگ اُس سے شادی اور توطّن کے لئے التجا کرتے تھے مگر وہ آزاد منش ہرگز قبول نہ کرتا تھا۔ جب مملکت فارس کے انتظام سے مایوس ہوا تو بندر عباس سے قصد ہندوستان کا کیا۔ انگریزی سوداگر جو وہاں تھے اس سے بہت محبت رکھتے تھے۔ خود کپتان جہاز اس کے پاس آیا اور کہا کہ ہندوستان جانا آپ کے لئے مناسب نہیں بہتر ہے کہ سفر انگلینڈ اختیار فرمائیے۔ مگر باتفاق آب و دانہ اُس وقت ایک جہاز سندھ کو جانے والا تھا شیخ سوار ہوکر غرّہ شوال ۱۱۴۶ھ ہجری کو ٹھٹھہ میں پہنچا۔ ہر چند بموجب اپنی عادت کے جہاں جاتا تھا اپنے تئیں چھپاتا تھا مگر چونکہ شہرت اور کمالات کے سبب سے آفتاب سے زیادہ اُس کا نام روشن تھا کچھ ایرانیوں نے پہچانا اُسی وقت خبر مشہور ہوگئی تمام اعزّہ و اراکین آموجود ہوئے۔ والہ داغستانی صاحب تذکرہ بھی اسی کے ساتھ ہندوستان میں آیا تھا۔[۱] غرض شیخ کو ملک اور آب و ہوا وہاں

[۱] یہ بھی تحقیق سے معلوم ہوا کہ آغا کلب عابد خاں صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر کے بزرگ اور شیخ مرحوم ہندوستان میں ساتھ آئے تھے۔

کی پسند نہ آئی۔ وہاں سے بھک ہو کر ملتان میں آیا دو برس رہا مگر مقامات گزشتہ میں بھی اور ملتان میں بھی اوضاع و اطوار ہند کا اتنا شاکی ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے کہ سوانح عمری وہی تھا کہ اب تک لکھا گیا۔ اس ملک کے داخلہ کو خاتمۂ عمر سمجھنا چاہئے۔ پریشانی مملکت ایران کی اب غنیمت معلوم ہونے لگی۔ اس مقام پر وہ نکتہ شناس ہند و اہل ہند کے کچھ خصائل اور خصایص بھی بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں کی آب ہوا کی خاصیت ہے کہ ہمت اور حمیت اور ہمدردی وغیرہ میں ضعف آجاتا ہے اور اس پر تاریخ ہائے مجوس اور حکمائے فارس کے کلام خصوصاً اولاد تیموریہ و بابریہ کے حالات سنداً لکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ ولایات شایستہ اور ملک ہائے خوش آب و ہوا کا آدمی ہندوستان میں ہرگز نہیں رہ سکتا۔ ہاں اگر کوئی ایسا ہی مانع سخت سد راہ ہو یا بسبب سفلہ مزاجی کے یہاں کی باتوں کا عادی ہو جائے تو رہ جائے۔ اور تماشا یہ ہے کہ اس ملک کے آدمی جو یہاں سے باہر نہیں گئے یہ جانتے ہیں کہ ہم بڑی فارغ البالی میں ہیں۔ یہاں تین چیزوں کے بغیر ہرگز کسی اشراف کا کام نہیں زر زور و افقکاری۔ ملک ہائے شایستہ میں جو ایک پیش خدمت سے کام چلتا ہے یہاں دس سے بھی نہیں نکل سکتا۔ اور مقدم تو یہ ہے کہ صاحب سلیقہ آدمی خود یہاں حکم عنقا رکھتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جتنا سامان زیادہ ہوتا جاتا ہے اتنی ہی بے انتظامی اور بے آرامی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ کئی جگہ لکھتا ہے کہ افسوس سفر فرنگ کو چھوڑ کر کیوں ادھر کا سفر اختیار کیا۔ اکثر اشعار میں یہاں کی مذمت کرتا ہے۔ انہیں میں سے ایک شعر ہے ؎

نسناس سیرتیست تمنائے مردمی	در دیو لاخ ہند کہ انسان نداشتست

غرض ملتان سے لاہور اور لاہور سے بے آرام ہو کر دلّی گیا۔ کہ تختگاہ شاہی ہے شاید وہاں آرام ملے۔ وہاں خود آشوب قیامت برپا تھا۔ برس دن وہاں رہ کر قصد مراجعت کیا۔ مگر لاہور آ کر معلوم ہوا کہ نادر مع فوج کے قندھار پر پڑا ہے اور کابل پر آنے والا ہے۔ شیخ کو یہاں کے رنگ ڈھنگ سے اُس کشورگیر کے آنے کے آثار معلوم ہو گئے تھے[۱] اور یہاں کے بدگمانوں کو بھی خوب دیکھ لیا تھا۔ اِس واسطے خیال کیا کہ اگر یہیں گیا اور پھر نادر آیا تو ہندوستانی میرے آنے کو بھی اس میں داخل سمجھینگے اور یہ اپنے لئے موجب بدنامی تصور کیا۔ ناچار اُلٹا دہلی کو پھر گیا۔ اور لطف یہ ہے کہ اگرچہ شیخ نہیں لکھتا لیکن معتبر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ دراصل شیخ نادر کی ناموافقت کے سبب سے ہندوستان کی طرف آیا تھا مگر تقدیر نے نادر کو یہاں بھی لا پہنچایا۔ چنانچہ اُس کی ایک رباعی بھی اس پر دلالت کرتی ہے ؎

تا چند زمانہ فتنہ اندوز شود	تا چند کمان کیں سیہ توز شود
زیبد کہ جہانیاں بہ پشمے نخرند	ملکے کہ نصیب پوستیں دوز شود

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نادر کے بزرگ شاید پوستیں دوز بھی ہوں ٭ نادر کی آمد آمد سُن کر شیخ براہ سلطان پور و سہرند[۲] دہلی میں پہنچا۔ جب نادر وہاں پہنچا تو شیخ نواح شہر میں کنارہ کش ہو گیا۔ پھر چند سال دہلی میں آ کر رہا اور ۱۱۵۴ھ ہجری میں سوانح عمری لکھی۔ کہتے ہیں کہ حقیقت میں شیخ ہندوستان کی بے انتظامی سُن کر بندگان خدا کی اصلاح حال کے لئے آیا تھا اور یہ بھی خیال تھا کہ بابر اور ہمایوں جس طرح

[۱] بزرگوں کی زبانی سُنا گیا کہ محمد شاہ کے دربار اور اہل دربار کی بدحالی کو دیکھ کر پہلے ہی شیخ نے کہدیا تھا کہ "اگر حال اینست چا واداز زادہ افشار (یعنے نادر) ملک ہندرا ہم بیگیرد"٭
[۲] رستہ کی بے انتظامی کی بہت شکایت کرتا ہے ٭

ایران سے مدد لائے تھے اُسی طرح یہاں سے مدد لے کر ایران کو نادر اور افغانوں کے ظلموں سے رہائی دلوائے ۔ مگر ملک کا حال پریشان اور دفتر و دربار کو ابتر دیکھکر کنارہ کش رہا اور ایسی بے نیازی اور استغنا سے بسر کرگیا کہ قیامت تک ایرانی فخر کیا کرینگے ۔ محمد شاہ شہنشاہ ہندوستان خود اُسکی ملاقات کو آیا[1] ۔ شیخ اُس وقت بوریے پر بیٹھا تھا کنارہ اُس کا اُٹھا کر ایک قطعہ الماس بقدر کف دست نکالا اور سامنے رکھکر کہا کہ ؎

برگ سبز است تحفۂ درویش   چہ کند بے نوا ہمیں دارد

محمد شاہ نے چند مرتبہ کئی لاکھ روپیہ بنام ضیافت دینا چاہا شیخ نے یہی کہا کہ بہ سیر ہندوستان آمدہ ام برائے گداگری نیامدہ ام ۔ بادشاہ نے بہت التجا سے وزارت تک دینی چاہی مگر اُس نے قبول نہ کی[2] ۔

کلام اُس کا با محاورہ اور متین اور صاف بے اشکال ہے ۔ بنیاد اُسکی نصیحت اور حکمت اور تصوف پر ہے ۔ قصائد حمد ہیں اور اکثر بزرگوں کی تعریف میں بھی ہیں ۔ حافظ کی غزلوں پر اکثر غزلیں اُس نے لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں ۔ بعضے حالات سے اُس کے خیالات عجیب قسم کے معلوم ہوتے ہیں ۔ اُس نے اپنے دیوان کو بہت خوشخط لکھواکر مُطلّا کرایا تھا ۔ بہت ادب و تعظیم سے چاندی کی رحل پر رکھا رہتا تھا اور صندل کی چوکی پر بیٹھ کر صدق دل سے تلاوت کی طرح پڑھا کرتا تھا ۔

شیخ ساتھ جامعیت کمالات کے عالی دماغ اور نازک مزاج بھی اس قدر تھا کہ اُس کی باتیں قابل تحریر ہیں ۔ خدمتگار تک بھی صاحب علم و کمال ۔ اشارت فہم رمز شناس رکھتا تھا کہ فقط اشارتوں پر کاروبار کرتے تھے ۔ جو کوئی ملاقات کو جاتا تھا اوّل وہ گفتگو کرکے دیکھ لیتے تھے اگر لائق ملاقات

[1] یہ روایت زبانی ہے کسی کتاب میں نہیں دیکھی گئی ۔ [2] یہ بات سیر المتاخرین سے معلوم ہوئی ہے ۔

پاتے تھے تو شیخ کو اطّلاع دیتے تھے نہیں تو باہر سے باہر رخصت کر دیتے تھے ۔ نقل ۔ ایک شخص نہایت وجیہ دولتمندانِ ہندوستان سے لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے شیخ کی ملاقات کو گئے ۔ نوکر نیا تھا ۔ ان کے لفافہ کو دیکھ کر دھوکہ کھایا اور شیخ کو اطلاع کر دی ۔ شیخ اُس وقت بے تکلف ایک پاؤں پھیلائے ہوئے کچھ بیٹھا لکھ رہا تھا ۔ جب یہ شخص جا کر بیٹھا تو بآدابِ محفل شیخ نے پاؤں سمیٹ لیا اور متوجہ ہو کر نام پوچھا ۔ اُس نے کہا محمد ایسفؔ[1] شیخ نے چیں بجبیں ہو کر پھر پاؤں پھیلا دیا اور کہا لاحول ولاقوۃ برائے محمد ایسف پا کشیدن چہ احتیاج داشت ۔

نقل ۔ رات کا وقت تھا نوکر سے پوچھا ۔ ع

	از شب چہ قدر رسیدہ باشد

اُس نے وہیں ہاتھ باندھ کر کہا ع

	زلفش بکمر رسیدہ باشد

نقل ۔ اُس کے نوکر کا نام رمضانی تھا ۔ مکھیوں کی کثرت سے شیخ نے گھبرا کر کہا کہ ع

	رمضانی مگساں می آیند

اُس نے کہا قربانت شوم ع

	ناکساں پیش کساں می آیند

شیخ نے ایک تذکرۃ الشعرا لکھا ہے جس میں ہر شاعر کی کیفیت حال فقط دو تین فقروں میں ادا کر دی ہے ۔ اُس کی بلند نظری کو خیال کرنا چاہیئے کہ نظامی گنجوی جس کے خمسہ کا جواب باصواب آج تک کسی سے نہیں ہوا اُس کے حق میں لکھتا ہے کہ در بعضے اشعار مثنویات از حوصلہ شاعری خود

[1] جہلا ہند کے اکثر محمد یوسف کو محمد ایسف کہتے ہیں ۔

بدر افتادہ۔ ابو الفضل اور فیضی کو لکھتا ہے کہ درزاغان ہند ازیں دو برادر بہتر نیرے برنخاستہ۔ ہندوستان کے شاعروں میں اکثر مضامین رنگین اور مطالب مغلق بہت باندھتے ہیں اور اسی سبب سے ناصر علی اور بیدل کے کلام کو پسند کرتے ہیں جو کہ شیخ اور اکثر اہل ایران کے خلاف ہے۔ چنانچہ شیخ اکثر کہا کرتا تھا کہ نظم ناصر علی و نثر بیدل بفہم نمی آید۔ اگر مراجعت ایران دست دہد برائے رنجشند بزم احباب رہ آوردے بہتر ازیں نیست۔ ہندوستان میں شعرا سے شیخ کی موافقت نہ ہوئی۔ اوّل تو بباعث نازک مزاجی کے اشعار اور گفتار اُس کے جو ہند کے باب میں ہوتے تھے اُسی پر کان کھڑے کرتے تھے دوسرے یہ کہ اُس زمانہ میں سراج الدین علی خان آرزو کے شہرہ نے نقارہ تسخیر بجا رکھا تھا اور شیخ بجائے خود جس رتبے کا آدمی ہے خود ظاہر ہے۔ جہاں جاتا تھا اہل فضل و اہل کمال اُسکے قدم آنکھوں پر لیتے تھے۔ خان آرزو کا بڑا فخر تھا تو یہ تھا کہ شیخ کے ملک کی زبان اچھی طرح سمجھ لیتے تھے یا کچھ کہہ لیتے تھے۔ کسی نے شیخ کے سامنے خان آرزو کی یہ غزل فخریہ پڑھی ؎

عشق روزے کہ بدل خلعت سودا بخشید	جامہ داری بتن از دامن صحرا بخشید
خجل از روے حبابم کہ باین تنگی ظرف	آنچہ در کیسۂ خود داشت بدریا بخشید

یہاں خان آرزو کی ہر بات سند اور کلام پر ہر محفل میں واہ وا و سبحان اللہ کا شور برپا ہوتا تھا۔ شیخ اپنی جگہ اُس مرتبۂ عالی پر۔ اُس نے سُن کر بے تکلف پڑھ دیا ؎

خجل از چشم حبابم کہ بیک ظرف تنک	آنچہ در کاسۂ خود داشت بدریا بخشید

اور کہا کہ ایں بابا از کیسہ تا کاسہ و از تنگی تا تنگی فرق نمی کند و باز خود را شاعر می گوید۔ خان آرزو کو بھی پہنچانے والوں نے یہ خبر جا پہنچائی۔

وُہ بہت خفا ہوا۔ شیخ کے پاس اوّل توکس و ناکس کو بار نہ تھی۔ عمائد و اراکین اگر جاتے تھے تو بپاس آداب زیادہ گفتگو بھی نہ کر سکتے تھے۔ چہ جائے مباحثہ اور وہ بھی اعتراض اُس کے کلام پر۔ اس واسطے جس جلدگر کی دوکان پر شیخ کی کتابیں جاتی تھیں وہاں خان آرزو نے راہ نکالی۔ اتفاقاً شیخ نے اپنی کسی کتاب کے ورق پر ایک غزل لکھی تھی اور اُس کے گرد ایک سانپ کھینچا تھا۔ لطیفہ اُس میں یہ تھا کہ گویا یہ خزانہ ہے اور سانپ اُس پر برائے حفاظت بیٹھا ہے۔ خان آرزو نے اوّل اُسکے مطلع ہی پر اعتراض کیا کہ سانپ کا سر کچلنا چاہئے اور چند اعتراض اور بھی لکھے تاکہ شیخ کی نظر سے گزرے۔ بعد ازاں اپنے شاگردوں کو زبانی اُس کے اشعار پر اعتراضات بتانے شروع کئے اور طرفین سے مقدمہ نے طول کھینچا۔ بلکہ شیخ کے دیوان کی رد میں ایک کتاب تنبیہ الغافلین لکھی۔ اُس میں چارسو شعروں پر اعتراض کیا ہے۔ جس کا جواب شیخ نے رجم الشیاطین لکھا۔ اُسی کے دیباچہ میں خان آرزو کی طرف اشارہ کر کے لکھتا ہے کہ یکے از جرگۂ حرامزادگان اکبرآباد۔ خان آرزو نے قصائد خاقانی کی شرح لکھی اور اُس میں اکثر اشعار کو بے معنے قرار دیا ہے۔ چنانچہ چند اشعار اُس قسم کے منتخب کر کے شیخ کے پاس بھیجے۔ شیخ نے اُن میں سے اکثر اشعار کے معنے بیان کئے اور دیکھا گیا کہ فقط تصحیف یعنی الفاظ کے غلط پڑھنے سے وہ قباحت واقع ہوئی تھی۔ اس قسم کی رکیک اور خفیف باتوں سے وہ فاضل عالی دماغ دق ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ بابا در ملک ہندوستان اعداد نماز پنجگانہ راکس نمی داند تا بحقائق علمی و دقائق حکمی چہ رسد۔ اس کے علاوہ بھی اکثر لطائف اور مطائبہ نمکین اُن کے جاری رہتے تھے۔ شیخ نے اپنے شعر

ہیں لفظ تمیز کو بوزن فعیل باندھا۔ خان آرزو نے اعتراض کیا کہ یہ اصل میں بروزن تفعیل ہے۔ کسی نے شیخ کے سامنے پڑھا شیخ نے کچھ جواب نہ دیا۔ بعد سکوت کے اتنا کہا کہ ع

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است

خان آرزو کے طرفدار شاہ لدھا بلگرامی نے شیخ کے پاس جا کر بے اظہار نام یہ شعر بہانۂ اصلاح پیش کیا ؎ بیضا آزاد

بتے دارم کہ باشد از حیا مشاطگی تنگش	خاگر پاے او بوسد زشوخی می پرد رنگش

شیخ نے سن کر کہا معلوم می شود کہ از کاسہ لیسان حرامزادہ اکبرآبادیست۔ شیخ یہاں کے اکثر اعتراضوں کو سن کر ہنسا کرتا اور کہا کرتا کہ یہ ہماری زبان ہے کہ جس دن سے پیدا ہوئے یہی زبان کان میں پڑی اور یہی بولتے ہیں۔ مقلد کو تقلید چاہیئے۔ چار کتابیں کہ صدہا سال کی تصنیف ہیں غلط سلط پڑھنے سے مرتبہ اعتراض نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ جو محاورہ تم لوگوں کے کان میں نہیں پڑا تم جانتے ہو کہ غلط ہے۔ ایران کی پنہاریاں تک جانتی ہیں۔ خان آرزو کا قول اس باب میں یہ تھا کہ زبان تمہاری بیشک ہے مگر اس قدر فرق ہے کہ ہم نے خاقانی و انوری سے حاصل کی اور تم نے پنہاریوں سے سیکھی۔ پس ایسے دو استادوں کے شاگرد کیونکر برابر ہو سکتے ہیں ؟

شیخ کے جن جن الفاظ پر خان آرزو نے اعتراض کیا ہے ٹیکچند بہار نے ان الفاظ کو تمام و کمال اپنے مصطلحات میں لکھا ہے اور کئی کئی شعر اس کی سند میں اساتذۂ متقدمین کے نقل کر کے صاف لکھ دیا ہے کہ جو کوئی اس مادہ میں اعتراض کرتا ہے وہ بباعث اس کی کم نظری کے ہے۔ شیخ ایک صاحبدل حق شناس بے طمع اور بے نیاز تھا۔

میری یادداشت میں ایسا آدمی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ چنانچہ سیر المتاخرین کی جلد دوم صفحہ ۲۰۸ سے ظاہر ہے انتہائی مرتبہ ہے کہ لوگ اُسے خیال کرتے ہیں کہ دست غیب تھا یا جنّات مسخر کر رکھے تھے اگر اگلے زمانے کی طرح لوگ سادہ لوح اور وہ خود مکّار ہوتا تو ہزاروں مرید جمع کرکے پیر بن بیٹھتا۔ لوگ جو جو باتیں اُس کی نسبت بیان کرتے ہیں ظاہرا خلاف قیاس معلوم ہوتی ہیں مگر چونکہ خاص و عام کی زبانی ہیں اس واسطے مجملاً لکھی جاتی ہیں کہ شجاع الدولہ والئ اودھ کے زمانے میں بنارس اور بانس بریلی تک کل اضلاع متعلق لکھنؤ تھے۔ نواب خود اُس کی ملاقات کو بنارس پہنچا۔ ایک دن صبح کے وقت شیخ کے پاس گیا۔ تمام موالی و اہالی باہر رہے۔ دو تین مصاحب ساتھ تھے۔ وقت ناشتا اور چاے کا تھا اپنے قاعدہ کے بموجب شیخ کا خدمت گار سب کے سامنے ایک ایک خوان لایا۔ اُس کا خوان پوش چھینٹ گلکار ریشمی کہ جھالر وغیرہ سے آراستہ تھا سامنے بچھایا۔ چند کلچہ نمکین و شیریں اور چند پیالیاں مربّے و اچار وغیرہ کی کہ سواے ایران اور جگہ ممکن نہیں چاے کے ساتھ تھیں۔ شجاع الدولہ دیکھ کر حیران ہوا۔ جب باہر آیا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ ساتھ تھے ہر ہر متنفّس کے لئے ویسا ہی ایک ایک خوان پہنچا تھا۔ شیخ چونکہ اُس کے انداز تحیّر کو سمجھ گیا تھا۔ کئی سو مرتبان مربّے اور آچار کے بہنگیوں پر بار کرا کے بھجوا دئیے۔

شجاع الدولہ ایک دفعہ شیخ کی ملاقات کو گیا۔ آصف الدولہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گیا۔ دو خوان اشرفیوں کے تحائف کے ساتھ پیش کئے۔ شیخ نے پیش خدمت کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ چیزے براے سرنثار صاحبزادہ بیارید۔ اُس نے ویسے ہی گیارہ خوان اشرفیوں

کے لاکر حاضر کر دئے ۔

جو لوگ اُس کی صحبت میں باریاب ہوتے تھے۔ اُن میں سے ایک شخص کی زبانی روایت ہے کہ خدمت گار نے آن کر کہا کہ مہاجن جس کی کوٹھی سے خرچ اُٹھتا ہے کچھ روپیہ چاہتا ہے۔ شیخ نے تھوڑی دیر تامل کر کے جس حجرہ میں نماز پڑھا کرتا تھا اُس کی طرف اشارہ کیا۔ نوکر وہاں گیا اور جاکر چند توڑے روپیوں کے لایا۔ ملازم مذکور کہتا تھا کہ میں ہر وقت اُس حجرہ میں جاتا رہتا تھا پہلے وہاں روپے مطلق نہ دیکھے تھے ۔

اِس میں شک نہیں کہ شیخ ساتھ خدا پرستی کے قناعت اور پاس وضع میں لاثانی تھا۔ دربار محمد شاہ سے بھی مدد اُس کی ہوتی تھی۔ امراے عہد خصوصاً نواب اودھ و مرشد آباد و بہار و بنگالہ وغیرہ اُس کی خدمت کرنی اپنے واسطے سعادت سمجھکر خفیہ سلوک کرتے تھے۔ جہلا یہاں کے اُسے دست غیب سمجھتے تھے ۔

حال اُس کی تجربہ کاری اور دُور بینی اور مصلحت اندیشی کا اوپر بیان ہوا مگر یہ نکتہ بھی قابل اظہار ہے کہ شجاع الدولہ نے فوج کمپنی سے جب مقابلہ کیا تو اوّل شیخ سے ملاقات کر کے مشورت طلب کی تھی۔ اُس نے اُسی وقت کہدیا تھا کہ دانایان فرنگ از فلاسفہ ایران گوے سبقت بردہ اند تو خود طفل ہستی جنگ تو باینہا راست نمی آید۔ چنانچہ انجام اُس کا جو کچھ ہوا ظاہر ہے ۔

بنارس میں جاکر شیخ کا ایسا دل لگا کہ پھر وہاں سے نہ نکلا۔ چنانچہ خود کہتا ہے ؎

از بنارس نروم معبد عام است اینجا	ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

آخر سنہ ۱۱۸۰ ہجری میں فوت ہوا اور اپنی تعمیر کی ہوئی عمارت میں بموجب

اپنے تجویز کئے ہوئے سامان کے مدفون ہوا۔ راقم[ل] نے بھی مزار کی زیارت کی ہے۔ سرہانے چراغدان پر خاص اُس کی تحریر سے منقوش ہے ؎

اے روشن از جمال تو شبہائے تار ما	صبح قیامت است چراغ مزار ما

اور لوح کے دو پہلوؤں پر منقوش ہے ؎

زباں دانِ محبت بودہ‌ام دیگر نمی دانم	ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا
حزیں از پاے رہ پیمائے بسے سرگشتگی دیدم	سرِ شوریدہ بر بالین آسایش رسید اینجا

بنارس کے لوگ اب تک اُس سے کمال اعتقاد رکھتے ہیں ؛

جو لوگ شائق علم کے ہوتے ہیں وہ واسطے تیزی ذہن اور حصول علم کے لئے چالیس دن وہاں قرآن پڑھتے ہیں اور کتاب وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں مشہور ہے کہ علم سے بے بہرہ نہیں رہتے ؛

جو تبرکات بزرگوں کے اُن کے پاس تھے منجملہ اُن کے ایک کاسہ ہمارے پیغمبر صاحب کی صاحبزادی کا بھی تھا چنانچہ وہ بھی وہاں ایک ایک حجرہ میں رکھا ہے اُس میں مردوں کے جانے کی اجازت نہیں۔ فقط عورتیں جاتی ہیں کو وہاں میلہ ہوتا ہے۔ بلکہ اُسی نام سے اُس کل مکان اور وہاں کے میلے کا نام فاطمان مشہور ہے ؛

ل

الله

یا محسن قد اتیک المسئ

العبد الراجی رحمۃ ربہ الغفور

محمد المدعو بعلی ابن ابی طالب الجیلانی

روشن شد از جمال تو شبہائے تار ما

صبح قیامت است چراغ مزار ما

زباں دانِ محبت بودہ‌ام دیگر نمی دانم ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پاے رہ پیمائے بسے سرگشتگی دیدم سرِ شوریدہ بر بالین آسایش رسید اینجا

تفصیل تصانیف

[1] ساقی نامہ ہزار شعر۔ [2] دیوان اوّل مشتمل بہ غزلیات و رباعیات و قصائد و مثنوی ۷ ہزار شعر۔ [3] دیوان دوم ۱۰ ہزار شعر۔ [4] مثنوی تذکرۃ العاشقین ایک ہزار بیت۔ [5] دیوان سوم ۴ ہزار شعر۔ [6] دیوان چہارم ۱۱ ہزار شعر۔ [7] مثنوی بطرز بوستان مسمّٰے بہ خرابات۔ [8] حاشیہ امور عامہ بہ شرح تجرید۔ [9] رسالہ تحقیق غنا۔ [10] رسالہ منطق۔ [11] لوامع مشرقہ در معنی واحد وحدت الوجود۔ [12] چند رسائل علم الٰہیات ہیں۔ [13] توفیق توافق حکمت و شریعت ہیں۔ [14] توجیہ کلام قدماے مجوس مبدء عالم ہیں۔ [15] حواشی بر شرح حکمت اشراق۔ [16] روائح الحیات۔ [17] ابطال تناسخ براے طبیبین۔ [18] شرح رسالہ کلمۃ التصوف شیخ اشراق۔ [19] حاشیہ بر الٰہیات شفا۔ [20] حاشیہ بر شرح ہیاکل النور۔ [21] فرائد الفوائد۔ [22] رسالہ در مدارج حروف۔ [23] رسالہ در جفر۔ [24] فرشتانامہ۔ [25] شرح وافی بر فصوص الحکم شیخ محی الدین عربی۔ [26] مفرح القلوب در طب۔ [27] مجربات۔ [28] رسالہ در تجرد نفس۔ [29] رموز کشفیہ۔ [30] رسالہ امامت۔ [31] کنہ المرام در قضا و قدر۔ یہ تصانیف اُس کی سوانح عمری میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ رسالہ صیدیہ تحقیق میں حلال و حرام او ریکروہ جانوروں کے۔ رجم الشیاطین اور تذکرۃ الشعرا و تذکرۃ المعاصرین بھی دیکھا گیا۔ اور چیدہ چیدہ رسالے مطالب مختلف میں بہت ہیں کہ جس کی تفصیل طول چاہتی ہے اور گنجائش اُس کی اس مختصر میں نہیں ٭

اشعار منتخب

رباعی	برخیز حزیں از سر دنیا برخیز تنہا تو دریں انجمن بیگانہ	زیں کہنہ زمن نواے مسیحا برخیز برخیز ازیں میانہ تنہا برخیز

گر رخ بنمائی اے خوش لقا چه باشد — ما را ز ما ستانی اے دلربا چه باشد
از وصل خود بریدی گوئی چه جور دیدی — خود فصل ماجرا کن جور و جفا چه باشد
شمع جمال موسیٰ شد برق و طور را زد — نار کلیم آں بود نور خدا چه باشد
از یار ناموافق دوری ضرورت آمد — گر ساعتے نشینی از خود جدا چه باشد

انوار مرشد روم شد راهبر حزیں را
گر همتے بخواهی از اولیا چه باشد

از وضع ز خود رفتگی یار خرابم — از حیرت آں آئینهٔ رخسار خرابم
فریاد که از هستئ من گرد بر آمد — از شیوهٔ آں قامت و رفتار خرابم
موسیٰ بهمیں جرم ز خود رفت مکن عیب — گر من به تجلّی گهِ دیدار خرابم
با جلوهٔ حسنِ تو ندارم خبر از خویش — چوں بلبل شوریده بگلزار خرابم

دیروز حزیں از مئے وصلش دل و جاں مست
امروز ز محرومئ دیدار خرابم

زاهد بیا و روئے براہِ صواب کن — بگذار دل ز دست و بساغر شراب کن
مطرب گفت ز دامنِ مطلب جدا مباد — دستے بتار و طرۂ چنگ و رباب کن
زاں پیشتر که گردش دوراں کند خراب — ساقی مرا بیک دو سه ساغر خراب کن
گر عهد گیسوے تو بگلزار سر زند — بفگن بطرهٔ ناب و سنبل عتاب کن
بشنو حدیثِ حافظ شیریں سخن حزیں — دور فلک درنگ ندارد شتاب کن

مناجات

خدایا بجاه خداوندیت — که بخشی مقامِ رضامندیت
طمع نیست از کشت بیحاصلم — بخوشنودیت کار دارد دلم
بسے شرمسارم ز نفس فضول — ز طاعت مکدر ز عصیاں ملول
ندارم بجز عجز چیزے بکف — شد از کف مرا نقد فرصت تلف
بدرگاهت آورده ام عجز خویش — سر از شرم بے برگی افگنده پیش

سراج الدین علی خان آرزو

ہندوستان میں ایسا شاعر اور ساتھ اس کے محقق زبان فارسی کا پیدا نہیں ہوا۔ کلام اُن کا بموجب اصول اہلِ زبان کے نمکین اور رنگین ہوتا ہے۔ صاحب تصنیف اور کثیر التالیف تھے۔ علاوہ شاعری کے زبان کی تحقیقات میں اُن کی طبیعت کو ایک مناسبت خداداد تھی۔ اُنہیں علوم و فنون کے کتب متداولہ پر عبور ہی نہ تھا بلکہ خود استادوں کی کتابوں پر جو شرحیں اور لغت فارسی کے تحقیق اور معانی و بیان میں رسالے اور کتابیں لکھی ہیں اُن سے اُن کا کمال ثابت ہوتا ہے۔ ہندی فارسی عربی کی زبان میں جو سلسلہ اتحاد اصلیت کا ہے یہ اُس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ہر جگہ جتاتے جاتے ہیں۔ خان آرزو اگرچہ زبان فارسی میں ٹیک چند بہار سے تحقیق میں فائق نہیں۔ مگر چونکہ تحقیق کے ساتھ زبان عربی اور اُس کے فروع میں کامل تھے اور ساتھ اس کے شاعر بھی تھے اور لطافت اور ظرافت طبع خداداد رکھتے تھے اس لئے فوقیت ثابت ہے۔ نوادر المصادر جو ایک کتاب ٹیک چند بہار نے لکھی ہے ایک جگہ اُس کا حوالہ دے کر خان آرزو اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ٹیک چند بہار کی تصنیف ہے جو کہ فقیر کے دوستوں میں سے ہے اور درحقیقت مصادر فارسی کو اس میں اس تحقیق سے لکھا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ ٹیک چند بھی ان کا نام نہیں لیتے جہاں لکھتے ہیں سراج المحققین لکھتے ہیں اور

[1] باپ کی طرف سے اور ماں کی طرف سے محمد غوث گوالیاری سے سلسلۂ خاندان ملتا ہے۔ (دیکھو خزانہ عامرہ)

اُن کے کلام کو سب اہل تحقیق مسلّم اور مستند جانتے ہیں۔ خانصاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خود بھی اپنے باب میں بڑے بڑے دعوے تھے۔ چنانچہ کتاب مثمر کے دیباچہ میں چند شعرائے فارس اور ہند کے نام لکھ کر کہتے ہیں کہ "دریں ولا کہ ہندوستان خالی از اہل کمال است ناموس سخنوری را بزور درگردن ایں ہیچمداں بستہ اند" اگر یہیں تک صبر فرماتے تو چنداں محل شکایت نہ تھا۔ مگر انہیں اس پر صبر نہ ہوا چنانچہ پھر کہتے ہیں کہ "لطف اینکہ شنیدہ نمیشود کہ در ایران ہم شخصے باشد کہ قائم مقام صائب و کلیم باشد"۔ نتیجہ اس کا یہی ہوگا کہ ہند کیا بلکہ اب ایران میں بھی خان صاحب ہی خان صاحب ہیں۔ انہیں خیالات نے برانگیختہ کیا کہ شیخ علی حزین کے دیوان پر تنبیہ الغافلین لکھی اور سمجھ لیا کہ ہم نے اس کے دیوان کو رد کر دیا۔ مگر خان آرزو کے کمال اور تحقیق میں اس سے کچھ نقص نہیں پیدا ہوتا۔ ہاں ایک امر نازیبا ہے کہ انہوں نے ایک اور صاحب کمال کے کمال کو مٹایا۔ یا خود دعوے کمال کا کیا۔ مگر کچھ جھوٹ بھی نہیں کیا۔ کیونکہ وہ خود مرد قابل تھا اور ایسے دعوے کے لائق تھا۔ البتہ تعصب یا تعلّی جو کہ بمقتضائے بشریت یالازمہ شعرا و اہل علم ہے وہ ہے۔

لطیفہ

ایک نوجوان کہ خان موصوف کو بھی اُس کی طرف نظر تھی سرراہ ملا۔ خان صاحب نے اُسے ٹھیرانا چاہا مگر وہ نہ ٹھیرا۔ انہوں نے باصرار روکا اور یہ شعر پڑھا ؎

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

اس کی تصنیفات اکثر راقم نے دیکھی ہیں عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ تصنیف اور استنباط اس تحقیق کے ساتھ بایں کثرت کیونکر ہو سکے۔ تفصیل یہ ہے :۔ سراج اللغت - چراغ ہدایت ۔شرح سکندر نامہ شرح زلیخا ۔ خیابان گلستان ۔ موہبتہ عظمےٰ ۔ عطیۂ کبرے ۔ علم معانی و بیان میں ۔ مثمر ۔ فواعد فارسی ہیں ۔ داد سخن ۔ تنبیہ الغافلین شرح گل کشتی مگر قتیل کہتا ہے کہ وارستہ کی شرح گل کشتی کے مسوّدے خان صاحب کے ہاتھ آگئے تھے اُنھوں نے اس میں اپنا نام لکھکر رائج کردی ۔ اور بہت سی نقلیں کرواکے خود کتاب فروشوں سے بکوائیں تاکہ رواج اس کا ہوجائے چنانچہ آج ہر شخص اس کو خانصاحب ہی کی تصنیف جانتا ہے۔

قتیل کو خاں صاحب کے اظہار کمال کی تاب نہیں وہ اپنی تصنیفات میں اکثر طنز کر جاتا ہے ۔ چنانچہ چراغ ہدایت میں جہاں خاں صاحب نے لفظ بہار اور بہاری کی توضیح کی ہے تو لکھا ہے کہ بہاری منسوب بہ بہار مانند گلہاے بہاری و نصف نام ہندو کہ نامش بہاری لعل باشد آرزو مشہور ۔ و تخلّص فقیر ۔ کہار بہ تشدید قومیست در ہند کہ بار کشند ۔ و در ہندی مخفف مستعمل است ۔ سرّیصاف بکسر سین مہملہ و تشدید را نام پارچہ ایست در ہند ۔ رکیپتان پیر نرسایان ؎

قتیل نے اس قسم کے الفاظوں کی تحقیق خان صاحب کے طرز پر کی ہے اور ساتھ اُس کے بہت نمکینی سے ظرافت خرچ کی ہے اور لکھتا ہے ۔ کہ ہم بھی عربی اردو فارسی یونانی سریانی انگریزی ۔ پوربی پنجابی ۔ مارواڑی کو یکجا کرکے کچھ لکھینگے اور محاورۂ اہل ایران اس کا نام رکھینگے ۔ چنانچہ اوپلہ بضم ہمزہ و سکون باے فارسی و فتح لام ماقبل ہاے مختفی چیزیست کہ از سرگین گاؤ یا حیوان دیگر در ہند بعمل آرند۔

وتنور و اجاق را بآں گرم نمایند۔ مینا نام مرغیست در بنگالہ کہ ہیچو اطفال حرف میزند و نام دختر باغبان لالہ بختل۔ تلنگہ لقب سپر بادشاہ فرنگ ۔ اس میں شک نہیں کہ خانصاحب کے کپیتان کی تحقیق اس تلنگہ کے معنوں سے کچھ رنگیں تر ہے ۔

قتیل نے اس کے علاوہ بھی بعض اشعار ہیں جو اس صاحب کمال سے بمقتضائے بشریت فروگزاشتیں ہوگئی ہیں لکھی ہیں۔ مثلاً اس شعر میں ؎

غیر از براے یار مئے ناب می برد		ایں ماجرا ہمیں چہ قدر آب می برد

معنے اس کے ظاہر ہیں کہ ببیں ایں معاملہ چہ قدر دشوار واقع شدہ۔ خان صاحب نے ماجرا آب بردن کو خاص ایک محاورہ سمجھا ہے۔ اسی طرح ؎

پیش رخت باختہ گل رنگ خویش		بلبل دلسوختہ آہنگ خویش

یعنی تیرے رخ کے سامنے گل اپنا رنگ اُڑا بیٹھا اور بلبل دلسوختہ اپنی آواز کھو بیٹھی۔ خانصاحب نے نفس سوختن پر قیاس کرکے کہا ہے کہ بلبل دل اپنی آواز جلا بیٹھی یعنی کھو بیٹھی۔ حقیقت میں ذہن لطیف اس بات کو کب مانیگا پہلے مصرع میں گل سے عام گل مراد ہو۔ اور دوسرے میں بلبل سے بلبل دل سے استعارہ کرکے معنے نکالیں۔ اور اگر غور سے دیکھو تو تنبیہ الغافلین جو شیخ علی حزین کے دیوان پر لکھی ہے اُس میں اکثر ایسے ایسے اعتراض ہیں کہ بااسے تعصب کہیں یا جہالت کہیں کہ ایک قباحت دوسری قباحت سے سخت تر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مقلد آدمی سے غیر زبان میں صحت کا تعجب ہے جتنی غلطی کرے تھوڑی ہے۔ مگر بلند پروازی ہر شخص پر چوٹ کرنے سے منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ باوجود اس کے اس اظہار حق سے بھی درگزر نہیں ہوسکتی کہ طریقہ اس کی تحریر کا ایسا چست ہے

کہ مناظرہ کی جان ہے اور اعتراضات بلکہ ہر بات کو اس خوبصورتی اور نمکینی سے بیان کرتا ہے کہ دل نشین ہو جاوے اور ہر بار پڑھنے میں ایک لطف آئے ۔

اشعار منتخب

اگرچہ نیست زرِ سرخ در خزینۂ ما
خُم شراب شفق گوں بود دفینۂ ما

سوال از منِ مخمور صبح حشر چہ شود
دماغ اینکہ کسے را دہم جواب کجا

حسن پیدا ز عشق گردیدہ است
ظاہر است ایں ز یوسفؑ یعقوب

میکشی دیوانگاں را قید دیگر بودہ است
دورِ ساغر حلقہ بر زنجیر ما افزودہ است

درید جامۂ یوسف کشیدنِ داماں
گنہ ز جانبِ سرپنجۂ زلیخا نیست

در گرہ بستیم چوں تخمِ حنا
شوق پابوسی کہ ما را در دل است

نشد کہ یک دو قفس مرغِ دل کنند آزاد
اگرچہ چشم بتاں را مدام بیماری است

ایں بشارت برسانید بمرغانِ اسیر
کاشیاں بر دلِ محزوں ز قفس تنگتر است

قحط بلبل شدہ در باغ ز بیدادِ شما
ایں سخن را برسانید بہ صیادے چند

اے زخم دل نہ بہ شدنت در خجالتم
بیدردِ ہاے چشم نمے داشتی چہ شد

مہِ کامل بنورانیِ رخِ دلبر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

روم ز خویش اگر آں نگار فرماید
جنوں چہ کار بود چوں بہار فرماید

شوم غبار و نخیزم ز راہِ او تا حشر
ہمیں قدر ز منِ خاکسار می آید

ناخواندہ نامہ بر سرِ عاشق زدی زناز
پیغامِ اشتیاق مرا ایں جواب بود

عقل است سراسیمہ تر از عاصیِ محشر
کز عشقِ تو ام شورِ قیامت بسر افتاد

آرزو بر سطرِ ما مسطر زدن بیجا است
ہست بیجا اینکہ خوباں چیں بر ابرو میزنند

کرد ما را خوش گرفتارے دلِ او شاد باد
خانۂ زنجیر سازانِ جنوں آباد باد

صنما قصدِ جانِ من داری
دشمنِ بندۂ خدا شدۂ

نورالعین واقف

واقف تخلص نورالعین نام رہنے والا بٹالہ کا قاضیوں کے خاندان سے تھا اور باپ اُس کا بٹالہ کا قاضی تھا۔ تحصیل علوم اپنے گھر پر بقدر ضرورت کی اور طبع موزوں کے سبب سے شاعری پر متوجہ ہوکر شاگرد خان آرزو کا ہوا۔ کثرت شوق یہاں تک تھی کہ باوجود نہ ہونے ڈاک اور صفائی راہ کے دہلی اور اکبر آباد غزل بھجواکر اصلاح لیتا تھا۔ بہ نسبت استاد کے کلام کے اس کا کچھ مختلف ہے۔ کیونکہ استاد کے کلام میں ایک قسم کی رنگینی اور نزاکت ہے اور اس کے کلام میں محض صفائی اور پابندی محاورہ کی ہے۔ کلام اُس کا اگرچہ پرزور نہیں اور بلند پروازی بھی کم کرتا ہے۔ لیکن لطیف اور خوش آیند صاف صاف باتیں ہیں کہ سُننے سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت اُس کی آزاد اور دل کم طمع تھا۔ مثل اور شاعروں کے نہ بیقدری کی شکایت کرتا ہے نہ کسی بادشاہ یا رئیس کی تعریف میں قصیدہ لکھا ہے۔ مگر دیوان ضخیم غزلیات و رباعیات کا موجود ہے جو اُس کے کمال پر دلالت کرتا ہے اور یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک ہندی آدمی ہو اور زبان غیر میں ایسی مشق کلام کرے کہ اہل زبان اُسے پسند کریں۔ اہل ایران اس کے کلام کو سُن کر کہتے ہیں کہ۔ زاغ ہند زبان طوطی از کجا یاد گرفت۔ اضلاع مشرقیہ ہندوستان میں بنارس تک سفر کرنا اس کا پایا جاتا ہے۔ اور شمال میں کابل تک۔ اور جنوب میں بہاولپور

تک - لکھنؤ میں جاکر مرزا فاخر مکین سے ملاقات کی - مرزائے مذکور اگرچہ بے کمال نہ تھا لیکن نہایت مدمغ اور مغرور تھا - واقف کے کلام کو خاطر میں نہ لایا - اور اعتراض اور اصلاحیں جا و بیجا کرکے بنیاد لڑائی کی ڈالی چنانچہ واقف نے اُس کی شان میں یہ شعر کہا ہے ؎

مرزا مکین مانشود چوں مکین ما	مکین است جزو اعظم مرزا مکین ما

بنارس میں جاکر شیخ علی حزین قزوینی سے ملاقات کی - چونکہ شہرہ اُسکے کلام کا ہندوستان میں عام تھا - ابھی نام ظاہر نہ کیا تھا مگر شیخ نے وضع سے معلوم کیا کہ وطن اس شخص کا پنجاب ہے - پوچھا کہ بو اقف واقفی - اس نے متبسم ہوکر کہا - کہ واقفم - شیخ سمجھ گیا اور اُٹھکر بغلگیر ہوا - بعد گفتگوے معمولی کے شعر طبع زاد کے پڑھنے کے لئے فرمایش کی - نور العین نے یہ شعر پڑھا ؎

بہمراہ پدر تا چند اے زیبا پسر گردی	الٰہی بے پدر گردی الٰہی بے پدر گردی

شیخ نے اُسی وقت اصلاح دے کر پڑھا کہ ؎

بہمراہ پدر تا چند اے کافر پسر گردی	خدا سازد یتیمت تا گران قیمت گہر گردی

بعد ازاں واقف نے یہ شعر پڑھا ؎

سیہ چوری بدست آں نگار نازنیں دیدم	بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے عنبریں دیدم

شیخ نے کہا کہ ہمیں بس است کہ ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے	بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

واقف نے بھی ان اصلاحوں کو تسلیم کیا - احمد شاہ دُرّانی بادشاہ کابل کے دربار میں اوّل اس کا شہرۂ کلام پہنچا اور پھر حسب الطلب خود پہنچا - اگرچہ کوئی قصیدہ اُس کی تعریف میں نہیں دیکھا گیا - لیکن کہتے ہیں کہ اول دربار میں شاہ نے سر دربار فرمایش کی کہ اپنی تصنیف سے کچھ سناؤ -

واقف نے کہا ہے

نادیدہ ہیچکس ظل پیمبر	بحمداللہ کہ ظل اللہ دیدم

لیکن درحقیقت اس میں توارد یا سرقہ امیر خسرو کی اس رباعی سے ہے۔

رباعی امیر خسرو

صد شکر کہ روے بادشارا دیدم	این بارگہ عزّ و علارا دیدم
پیغمبر را سایہ ندید است کسے	ماییم کہ سایۂ خدارا دیدم

یہ رباعی بھی واقف نے اُسی ملک میں کہی تھی

آں طفل کہ مست ساغرِ نادانی است	عالم ز غمش خراب و سرگردانیست
می نالم و رحم نایدش برمن از انکہ	او ترک زبان و نالہ ام افغانیست

بعد ازاں بہاولپور میں گیا اور نواب بہاولپور کے دربار میں ملازم ہوگیا۔ ہندوستان میں مرہٹوں کے حملوں سے اُس وقت تباہی اور پنجاب میں افغانوں اور سکھوں کے تہلکوں سے بربادی ہو رہی تھی۔ یہاں سے اُمید منقطع کرکے وہیں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ اب بھی اولاد اُس کی وہاں باقی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ سب خاندان میں کوئی اس قابل نہیں ہوا کہ باپ کا نام روشن کر سکے۔ غرض واقف نے ۱۱۹۰ھ ہجری میں اس عالمِ فانی سے کوچ کیا۔ اس کے دیوان کے ۵۴۴ صفحے ہیں فی صفحہ ۱۶ بیت۔ مخمس وغیرہ ۵۰ ہیں۔ اسکے حالات سے کسی مذہب کی پابندی کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

غزلیات واقف

اے بہ بزمِ شوق تو نالاں زہر سو سازہا	رفتہ در ہر گوشۂ زاں سازہا آوازہا

مہ جبیناں جبہہ سا بر آستانت از نیاز | نازنیناں بر در بت از سر نہادہ نازہا
درہوائے اوج توحید تو از کف میرود | طائران قدس را سررشتہ پروازہا
رازہایت را بسے گفتند سرمستان عشق | ہمچناں ہستند لیکن سربہر آں رازہا
راہ بے انجام حمدت سرچو کردند اہل فکر | کردہ در اول قدم گم خویش را آغازہا
کے تواند پر زدن در صیدگاہ حمد تو | میکند ہرچند شاہین خرد اندازہا

از رگ و پے بندہ واقف ہمیں در لہ ہاست
اے بہ بزم شوق تو نالاں ز ہر سو سازہا

پروردہ گرچہ عشق بخون جگر مرا | افگند یار ہمچو سرشک از نظر مرا
رفتی بسوئے یار و نکردی خبر مرا | خون شد بہ بیوفائیت اے دل جگر مرا
اے اشک رفتن تو بہ ایں رنگ خوب نیست | ترسم کہ رفتہ رفتہ کنی بے جگر مرا
از دست دل کجا روم اے وائے کیں بلا | نہ در سفر گزارد و نے در حضر مرا
خواہم سعادتے ز طواف قفس برم | ورنہ چہ حاصل است ازیں مشت پر مرا

بودم ہنوز طفل کہ سوز دلم چو اشک
واقف فگندہ بود ز چشم پدر مرا

دلا نمی شنوم از دو شب فغان ترا | کہ مہر کردہ ندانم دگر دہان ترا
خراب تیر نگاہ تو خانۂ دل ہا | خدا خراب کند خانۂ کمان ترا
بسم ز خون تو آلودہ و تو نازک طبع | چگونہ بوسہ زنم خاک آستان ترا
ازاں بکوئے تو شبہا خموش می باشم | کہ درد سر نتواں داد پاسبان ترا
نمی کشائی شمشیر از کمر یک دم | کہ بستہ است بقتلم چنیں میان ترا
بیک اشارۂ ابرو نبرد زورم | بگو چگونہ کشم اے جواں کمان ترا

ازاں قصور کہ واقف تو در وفا کردی
نمیخورد سگ دلدار استخوان ترا

خوش آنکه برویت نظرے داشته باشد | یا از سر کویت گزرے داشته باشد

سر در سر کارت کنم انشاءالله | تن زار و نزارت کنم انشاءالله
دل رفت بفرمان تو للّٰه الحمد | جاں نیز نثارت کنم انشاءالله

بکنارِ کسے نمی آئی | تو بکارِ کسے نمی آئی
از برائے تو چوں تواں مُردن | بمزارِ کسے نمی آئی

غزل

نگاہت آفتِ دوراں شد و ہنوز کجاست | بلائے دین و دل و جاں شد و ہنوز کجاست
بدور غمزهٔ بیباک و بیگنہ کش تو | ز کشته پشته فراواں شد و ہنوز کجاست
کشید حسنِ تو زنّار را ز پرده بروں | ہزار صومعہ ویراں شد و ہنوز کجاست
بیک تطاولِ زلفت که عمرش افزوں باد | ہزار جمع پریشاں شد و ہنوز کجاست

زداغ سوختگانِ تو دیدهٔ بد دور
تمام شہر چراغاں شد و ہنوز کجاست

توئی که رحم به جاں ہائے مبتلا نه کنی | توئی که ہیچ دل از بند غم رہا نه کنی
توئی که شوخیِ حسنت نمی دہد آرام | بدل قرار نگیری بدیده جا نه کنی
توئی که خونِ عزیزاں نمودهٔ پامال | بزیر پا نظر از فرطِ کبریا نه کنی
توئی که در طبِ تست معجزِ عیسے | ولے چه سود که یک خسته را دوا نه کنی
توئی که شیوهٔ بے باکیت گذشت از حد | ستم بخلق کنی ترس از خدا نه کنی
توئی که عادت بیگانه پروری داری | توئی که حاجتِ یک آشنا روا نه کنی
توئی که حسنِ تو نگر خدا نصیب تو کرد | توئی که حقِ فقیراں خود ادا نه کنی

توئی که داده خدا ساز مرگ عیش ترا — ترحمی بگدایان بے نوا نہ کنی
توئی که راهِ وفا کردهٔ غلط صد ره — براهِ جور و جفا یک قدم خطا نه کنی
توئی که عهدِ تو پاد از نیست همچوں گل — بدست هر که بیفتی باو وفا نه کنی
توئی که کرده خدا بادشاهِ حسن ترا — توئی که لطف بحالِ منِ گدا نه کنی

توئی که ساختهٔ دردمند واقف را
توئی که چارهٔ آں دردمند را نه کنی

دیوانه ایم شهر بما نامبارک است — بیروں کشیم رخت که صحرا مبارک است
بوئے ز زلفِ یار بجاں هیچ میکند — اے دل بدرد ساز که سودا مبارک است
در قتلِ ما مضائقه خوباں برائے چیست — ما را مبارک است و شما را مبارک است
یارِ عزیز باعثِ عمرِ دوباره است — یوسف خریدن تو زلیخا مبارک است
زخمم زدی که تا دمِ پیری کهن نشد — دستِ تو اے جواں چقدر ها مبارک است
در چشمِ من نشستی و کردی شکار خلق — بیروں مرو ز دیدهٔ من جا مبارک است
عریاں سان عشق ز خاکِ حریمِ دوست — در سر اگر کنند سرا پا مبارک است

شوم است دیدن تو در ابنائے روزگار
واقف گدائیے درِ دلها مبارک است

بجانم از تو کدام آفت و بلاست که نیست — در آیه غمکدهٔ دل ببیں چه ها ست که نیست
بکیمیا طلبی کرده خلق بدنامم — وگرنه آرزوئے وصلِ تو کراست که نیست
ترا بشیوهٔ دلداری آنچه بایستے — تمام هست ولیکن همیں وفاست که نیست
ز فتنه نیست بعهدِ تو گوشهٔ خالی — ز قامتِ تو قیامت بگو کجاست که نیست
نبرده از تو کسے کاسهٔ امید تهی — نگاهِ لطفِ تو بر حالِ ایں گداست که نیست

بهر که می نگری واقف از هوس داغ است
دریں زمانه مگر عشق کیمیاست که نیست

صبا کجاست که او را نقاب بردارد / شود که طالع ما سر زخواب بردارد
که بخت خفتهٔ ما را زخواب بردارد / مگر صبا رخِ او را نقاب بردارد
بغیر پیر مغاں دیدهٔ جواں مردی / که بار غم زدلِ شیخ و شاب بردارد
براں سرم که زدست تو واکشم دل را / کرا دماغ که ناز و عتاب بردارد
خوش آمدی عرقِ سرد کن که تا نفسے / دماغ سوخته بوئے گلاب بردارد
علاج گریهٔ من کن وگرنه نزدیک است / که سیل خانهٔ من چوں حباب بردارد
نمیکنند عزیزاں بخواریم رحمے / مگر زخاک شہِ بو تراب بردارد
زبار محنتِ ایّام گردد آسوده / بدوش هر که سبوئے شراب بردارد
میانهٔ من و او طرفه حایل افتادی / خدا ترا زمیاں اے حجاب بردارد
زحسن تو حظ اولی بصر چه فیض برد / چه بهره کور سواد از کتاب بردارد

جگر ببیں که زتو کشته میرود واقف
بوادیے که خضر نیز آب بردارد

کے درد بافسانه و افسوں رود از دل / هرگز نرود گر بمثل خوں رود از دل
غم نیست که از درد تو ام خوں رود از دل / ترسم که باں درد تو بیروں رود از دل
آنرا که بعشق من حسنت نظر افتاد / لیلےٰ رود از خاطر و مجنوں رود از دل
هرگاه کند گریه ام از یاد تو طوفاں / سیحوں زجگر آید و جیحوں رود از دل
از باطنِ خم تا نرسد فیض یقینست / مشکل که ترا شک چو فلاطوں رود از دل

واقف بحضور تو چناں مضطرب افتد
کز بزم بروں ناشده بیروں رود از دل

یار نا پائدار را چه کنم / عمر بے اعتبار را چه کنم
من و آں هستی اصلی خویش / هستیٔ مستعار را چه کنم
من گرفتم که ساختم با بخت / بخت نا سازگار را چه کنم

ساخت در مردمان مرا رسوا
دیده اشکبار را چہ کنم
نہ بوصل است سازشم نہ بہجر
طبع ناسازگار را چہ کنم
گر توام ناامید می سازی
دل امیدوار را چہ کنم

گر نہ دیوانگی کنم واقف
خود بفرما بہار را چہ کنم

گر اینچنیں تو شوخ پسر فتنہ گر شوی
می ترسمت کہ آفتِ جانِ پدر شوی
زین سان میکشی تو مرا اے شبِ فراق
یارب کہ زود کشتۂ تیغِ سحر شوی

خاتمہ

کہتے ہیں کہ اُردو کے سب سے بڑے تاجدار نے برسوں کے بعد پھر محفلِ ادب کا اعلان کیا ہے۔ خدائی امدادیں شامل حال کر کے پُرانے شعرا کو دعوتی رقعے بھیجے ہیں۔ زمین اُردو کو وسیع میدان قرار دیا ہے لفظی بندشوں اور رعایتوں سے پنڈال کا سماں باندھا ہے۔ اس میں انشا پردازی کے فرش بچھینگے۔ صدق عقیدت کی سواریوں پر مہمان آئینگے۔ خاص الخاص چھتیس کرسیاں بچھینگی۔ دھوم دھام ہوگی۔ ہجوم عام ہوگا۔ فارسی جام کے سرشار اور فدائی نیم نگاہی پر قربان بھی ہونگے۔ قصیدوں کے مارے کان پڑی آواز نہ سنائی دیگی۔ ہٹو بچو کے شور میں ایران و توران کے مہمان اُترینگے۔ اُردو کی سرزمین پر فارسی کی بولیاں بولینگے۔ انکے ساتھ ساتھ انکے قدردان بادشاہوں کی روحیں بھی سایہ افگن ہونگی۔ جلسہ جم جائیگا۔ تو حضرت آزاد جیسا ساقی آب حیات کے جام لنڈھائیگا۔ دَور پہ دَور چلینگے۔ اور مُدتوں کے پیاسے آج پیاس بجھائینگے پھر سب مل کر دعا مانگینگے۔ کہ الٰہی ہندوستان میں نگارستان کو عمر دراز عطا کر کہ وہ پھر فارسی کو زندہ کرے تاکہ اُردو بولنے والے ہیں اور ہمارے حالوں کو آزاد کی زبانی سنا کریں ❊

طاہر

عرضِ کیفیّت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

اگرچہ میں اُن دنوں بچّہ ہی تھا۔ مگر مجھے خوب یاد ہے۔ کہ قبلہ وکعبہ نے اپنی آخری مجذوبیت پسند زندگی میں کبھی کسی مُتنفّس کو اپنے کتب خانہ کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں ؎

آ پہنچا نصیبوں سے بُلاوا اُنہیں رب کا	آخر شبِ عاشور کو تھی جس کی تمنّا

افسوس آفتابِ ادب چھپ گیا۔ عروسِ سخن کا سہاگ لُٹ گیا۔ اُردو زبان کے سب سے بڑے انشاپرداز نے اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کی طرف مراجعت فرمائی۔ میاں باوا کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک تو ان کا مکان بند ہی پڑا رہا۔ والد مرحوم سرکاری مصروفیت کی وجہ سے آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھ سکے۔ آخر بصد منّت ایک عزیز کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ وہ تمام کتب خانہ کی فہرست مرتب کردیں ؎

خدا ان صاحب کو ذرہ ذرہ اور بال بال اس کا اجر دے کہ بیس بائیس سال کی گرد آلودہ کتابوں کو خدا جانے کتنی خاک دھول پھانک کر ایک فہرست کی صورت میں مرتب کر دیا ؎

اب فہرست بن چکی تو والد ماجد نے خود تمام کتابوں کی پڑتال کی۔ اور بہت سی گزشتہ اور آیندہ بھلائیوں کو سوچ کر لفٹنٹ گورنر پنجاب سر لوئی ڈین بہادر کے ایما سے کتب خانۂ آزاد قلمی وچھاپہ تمام وکمال بغیر کسی معاوضہ کے یونیورسٹی لائبریری لاہور کے حوالے کر دیا۔ والد ماجد کی یہ فیاضی ہمیشہ یادگار رہیگی کیونکہ جناب آزاد کی تمام عمر کی کمائی یہی ایک کتب خانہ تھا۔ جس کو وہ ایران وتوران اور خدا جانے کہاں کہاں سے جان کے ساتھ لگا کر لائے تھے ؎

کتب خانہ تو اس طرح ٹھکانے لگا۔ اب رہے انکے مسوّدات اور بستے

انہیں بھی والد مرحوم نے کھولا تو مگر سرسری نظر سے دیکھا اور باندھ دیا۔ کہ پھر کبھی فرصت کے وقت دیکھینگے۔ مگر تقدیر کا جگر دوز تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ فلک کج رفتار کو بھلا کب بھاتا تھا۔ نصیبوں کا پھیر دیکھئے کہ اسی سال میرے کڑیل جوان بھائی آغا محمد اسمٰعیل آسیر ایم۔ اے کا امتحان دیتے دیتے سرسام کا شکار ہو گئے۔ ان کی صفِ ماتم اُٹھنے نہ پائی تھی کہ یکے بعد دیگرے دو جوان بہنیں ننھے ننھے بچے بیسیر چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئیں۔ یہ زخم بھی بھرنے نہ پایا تھا۔ کہ یکایک مصیبت کا آسمان پھر ٹوٹ پڑا اور میرے دوسرے بڑے بھائی جوان مرگ آغا محمد یوسف خلیل بیاہے تیاہے سہروں خون ڈال کر ہاتھوں میں لوٹ گئے۔ غرض کہ ان پے در پے صدمات نے والد ماجد کو ایسا مضمحل کر دیا کہ پھر کبھی اُن چیزوں کا نام ہی نہ لیا۔ آخر یہ تمام مرحلے طے کر چکنے کے بعد وہ بھی ۸ دسمبر ۱۹۲۰ء کو عارضۂ قلب کے بہانے اس بے وفا دنیا سے خفا ہو گئے اور دلی میں ؎

اپنے یوسف کے پاس دفن ہوئے
چشم یعقوب میں کہاں نعیم

حضرت والد صاحب کے انتقال کے بعد جب میں لاہور آیا تو سب سے پہلے عبرت کی نگاہیں اُنہیں پلندوں پر پڑیں۔ دل خون ہو گیا کہ افسوس حضرت آزاد کے جسمانی فرزند تو یوں خاک کے پیوند ہو گئے اور یہ معنوی فرزند جنہیں مولانا اپنے بچوں سے زیادہ عزیز جانتے تھے اور جان چھڑکتے تھے۔ ان پھٹے پرانے بستوں میں سوتے کے سوتے رہ جائینگے۔ حضرت آزاد تو اب بار بار آنے سے رہے۔ جو انہیں بنائینگے سنوارینگے اور ایک سے ہزار کرکے نکالینگے۔ اب تو یہی غنیمت ہے کہ اس بہتے دریا میں سے جو کچھ بھی ہاتھ آئے آجائے۔ ان تمام باتوں کو سوچ کر اُن مسوّدوں۔ بستوں اور گٹھڑوں کو کھولنا شروع کیا۔ کیا بتاؤں کہ ایک ایک کاغذ کا ورق لاکھوں جانداروں کے کلیجے سے لپٹا نظر آتا تھا۔ کیڑوں کی فوج کو کمال ہمدردی کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ غرض کہ اسی طرح روزانہ دو تین گھنٹے اس چھونکا پھانکی

میں صرف ہونے لگے۔ انہیں دنوں میں ایک دفعہ جناب میر ممتاز علی صاحب سے ملنا ہوا۔ تو باتوں باتوں میں مولانا کی غیر مطبوعہ کتابوں کا بھی ذکر نکل آیا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے فرمایا۔ کہ دیکھنا بھئی۔ اُستاد نے آب حیات کی طرح ایک تذکرہ فارسی شعرا کا بھی لکھا تھا۔ ایک دفعہ ہم نے دیکھا بھی مگر اسکے بعد تمہارے والد نے اور میں نے ہر چند کوشش کی ہاتھ نہیں آیا۔ تم ذرا خیال رکھنا مجھے معلوم تو پہلے بھی تھا مگر اب یقین ہو گیا۔ اور اس کی ٹوہ میں رہا۔

حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ ایک دن ایک بستہ کھول کر بیٹھا تھا کہ سامنے ابوعبداللہ محمد رودکی نام لکھا نظر آیا۔ دیکھا تو اکثر مسودہ نگارستان کا تھا۔ اُسی وقت میر صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے پہچانا تو مجھے کامل یقین ہو گیا کہ ع قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

مقام شکر اور فخر ہے کہ مجھ جیسے نااہل کے ہاتھوں اللہ میاں کو یہ کام لینے منظور تھے ورنہ میری ایسی تقدیر کہاں کی تھی کہ ایسے صاحب علم و فضل کی صحبت حاصل ہوتی۔ اور انکے مسودوں کی کاٹ چھانٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔ کہ ایسی اصلاح شاگردوں کو بھی میسر نہ آئی ہوگی۔

نگارستان کا قلمی مسوّدہ مختلف بستوں میں سے ملا۔ ایک جگہ جمع کیا تو تقریباً مکمل ہو گیا صفحوں کے نمبر بھی مل گئے۔ اگرچہ ایک ایک کاغذ الگ الگ ہے مگر ہر آیندہ صفحہ کا پہلا حرف پچھلے صفحہ کے آخر میں لکھا ہوتا ہے۔ مسودہ تمام خوشخط لکھا ہوا تھا۔ سوائے چند شعرا کے حال کے کہ جن کا پڑھنا ع صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

انکے علاوہ ایک دو پرچے بالکل ناقابل رکھنے اور پڑھنے کے ملے جنہیں پنسل کی نوشت نے حرف غلط کی طرح سے مٹا دیا تھا۔ مگر نظر گڑو دینے سے معلوم ہوا۔ کہ غالباً مرزائے فارسی حضرت غالب کا ذکر ہے جن کو مولانا نے آب حیات میں بھی فارسی کا شاعر مانا ہے۔ ایک جگہ حضرت بیکدل[1] لاہوری کا نام بھی پڑھا گیا۔ خدا جانے کس سلسلہ میں ہوگا مگر تھا ضرور۔

پہلے ہی میں نے جب کتاب کو پڑھا تو ترتیب میں کچھ فرق سا نظر آیا۔ اوّل سے آخر تک تمام شعرا

---

[1] بیکدل لاہوری سے مراد جناب فخر الشعرا مولانا احمد بخش صاحب چشتی ہیں۔ جن کا یہ مشہور شعر حضرت آزاد نے اکثر جگہ اظہار حال میں استعمال کیا ہے ؎

یکدل و خیل آرزو دل بہ کجا کجا دہم | سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

اپنی اپنی جگہ خوب بٹھاتے ہیں۔ مگر کمال اسمٰعیل اصفہانی۔ خواجہ سلمان ساوجی۔ رشید الدین محمد وطواط اور عبید زاکانی کو خدا جانے کس قصور پر مولانا نے ابوالفضل کے بعد رکھا ہے حالانکہ ان سب کو نظامی گنجوی کے بعد لکھنا چاہیئے تھا۔ میں نے اسکے متعلق حضور ڈاکٹر اقبال سے مشورہ لینا چاہا۔ لیکن ان حضرت نے ایک ہی بات سے میرا مُنہ کیل دیا کہ جس طرح مولانا نے لکھا ہے بغیر کسی تبدیلی کے حرف بحرف چھپوا دو ۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ تذکرہ شعرا ہے۔ سنین شعرا نہیں۔ ہر شاعر کا حال اپنی اپنی جگہ خود ایک علیحدہ مرقع ہے ۔

بعض شعرا کے انتخاب کلام بھی نہ مِل سکے۔ کیا جانے حالت جذب میں کہاں سے کہاں باندھ دئے۔ دو تین جلیل القدر شاعر بھی رہ گئے۔ مثلاً عمر خیام ابن یمین وغیرہ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی اس قدر شعرا کسی اُردو کے تذکرہ میں نہ ملینگے۔ اور حضرت آزاد کی انشاپردازی۔ لطیفہ سنجی اور ادائگیٔ مضمون کا لطف علیحدہ رہا ۔

تمام کتاب پڑھ جانے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کتاب آب حیات کے ساتھ ساتھ ہی لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ شیخ سعدی کے حال میں فرینکلن صاحب کی زبانی انکے مزار کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اسکے بعد سیر ایران میں اپنی آنکھوں دیکھی باتیں لکھی ہیں۔ مولانا نے بعض وجوہات سے سخندان فارس کا شائع ہونا مقدم جانا۔ بہت ممکن تھا۔ کہ سفر ایران کے بعد روحانی تجلّیات اگر اُنہیں فرصت دیتیں تو اسے بھی آب حیات جیسی آن بان کے ساتھ شائع کرتے۔ اور ہر دور پر خدا جانے کس کس طلسم کاری کے عنوان باندھتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا ۔

ایسی حالت میں نگارستان کو بھی دیکھ کر ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ کہ ایک نامعلوم نعمت اس طرح بن مانگی مراد بن کر مل گئی۔ کہ جس کا سان وگمان بھی نہ تھا ۔

اس دفعہ حرف بحرف مولانا کے مسوّدہ کے مطابق نگارستان فارس چھپا ہے۔ میں تلاش میں ہوں کہ بعض اور شعرا کا حال اور انتخابات مِل جائیں تو پھر ترتیب میں بھی وزن قائم کر کے دوسرا اڈیشن نکالوں ۔

کلمبس کو نئی دنیا دینے والے نے اس کے بعد مجھے بھی پے درپے مولانا کے غیر مطبوعہ جواہر ریزے دلوائے۔ جو انشاء اللہ بہت جلد ہدیۂ نظر ہونگے ۔

طاہر

آموزگار پارسی

اگر آپ نے آب زر سے لکھی ہوئی فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور قند پارسی سے بھی چاشنیِ زبان کو تازہ کر چکے ہیں۔ تو یہ آخری درس پارسی آموز سے بھی زبان مذکور کو اُجا لیئے۔ مولانا ممدوح نے سفر ایران کے بعد یہ دوسرا حصہ گفتگو پر لکھا تھا۔ مگر مسوّدہ کی حالت میں وقت کا منتظر تھا۔ اب تیار ہے۔ اس میں مختلف درس قائم کئے ہیں۔ آسمان زمین۔ گھر۔ بازار۔ دفتر۔ دوکان غرض کہ رائی سے پربت تک کے نکتے نکتے اور ذرّے ذرّے کو اس خوبی سے لکھا ہے کہ زبان اور کانوں سے اُتر کر دل میں اُتر جاتا ہے۔ نئی فارسی یا بول چال جو کچھ بھی کہئے۔ اس میں دریا اور کوزے کا مزہ آتا ہے۔ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد مبتدی نہایت آسانی کے ساتھ فارسی بول سکتا ہے۔ لکھ سکتا ہے۔ پڑھ سکتا ہے۔ آسانی زبان کے لئے فارسی کے سامنے اُردو کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔ جو اس کی قدر و منزلت کو دوبالا اور سہ بالا کرتا ہے ٭ ابھی زیر طبع ہے ٭